رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

قیمت ۸ر

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ر کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

تصانیف نیاز و پیتوری

نگار خانم بنت نیاز فتحپوری — نگار بنت نگار خانم

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عار)
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲- افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان اعلیٰ تخیل و پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عا)
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عدر)
علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے معہ انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عار علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت عہر علاوہ محصول

اگر آپ نے خط وکتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ نہیں دیا تو کوئی جواب نہیں دیا جائیگا۔ منیجر

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ۔ ششماہی تین روپیہ

ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بہ وجہ اضافہ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۳۹	فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۴۱ء	شمار ۴

ملاحظات ---------- ۲

بہت سے جھوٹ جو سچ سمجھ لئے گئے ہیں ---------- ۶

تاریخ اودھ کا ایک ورق ---------- مشیر احمد علوی ---------- ۹

لکھنؤ کی زبان ---------- سید محمد باقر شمس لکھنوی ---------- ۱۸

محبت کی چند نفسیاتی گھڑیاں ---------- مجتبیٰ حسن ---------- ۳۲

جرمنی کی چھتری والی فوج ---------- ۳۵

مکتوبات نیاز ---------- ۳۷

چراغاں ---------- ۴۲

نیرنجات کا بادشاہ ---------- ۴۴

دارالمصنفین کا تازہ کارنامہ ---------- سید محمد باقر شمس (لکھنوی) ---------- ۴۷

باب الاستفسار ---------- ۵۱

مطبوعات موصولہ ---------- ۵۳

کشکول ---------- ۵۷

دماغی تفریح ---------- ۵۹

منظومات ---------- عدم ۔ کوکب ۔ اشک ۔ گوہر ۔ کاوش ---------- ۶۱

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد-۳۹	اپریل سنہ ۴۱ء	شمار-۴

ملاحظات

ندویوں کے اخلاق

اس وقت عام طور پر تمام مولویوں کے اخلاق بہت مشتبہ نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں، لیکن اس جماعت کا ایک خاص "طایفہ" جو اپنے آپ کو ندوی کہتا ہے، اس کے بعض افراد نے اس اشتباہ کو دور کرکے یہ بات بالکل واضح کردی ہے کہ ندوی ہونا "مولویت" کی وہ منزل ہے جہاں "ندویت" اور "دنائت اخلاق" دونوں بالکل مترادف الفاظ ہیں

اس "طایفہ" کی سب سے زیادہ نمایاں ہستی اسوقت سید سلیمان ندوی ہیں، لیکن میں اس سب سے بڑے "ندوی" کی انتہائی اخلاقی بے مایگی اور ذہنی پستی کا ذکر نہیں کروں گا، کیونکہ اس کا تعلق زیادہ تر میری ذات سے ہے اور میں گالی دینے والوں کا جواب ہمیشہ خاموشی سے دیا کرتا ہوں، لیکن ندوہ کے نظام شمسی میں، اس آفتاب کے گرد جو اور بہت سے "اقمار" گھومتے نظر آتے ہیں، انکا ذکر غالباً ناموزوں نہ ہوگا

دسمبر کے نگار میں "سطحیات سید سلیمان ندوی" کے عنوان سے ایک مضمون "م-ا" کے قلم سے شایع ہوا تھا۔ اس کے شایع ہونے کے بعد دریاباد سے لیکر اعظم گڈھ تک ہلچل مچ گئی، اور یہ جستجو شروع ہوئی کہ "م-ا" کون ہے، یعنی بحث یہ نہ تھی کہ لکھا کیا ہے بلکہ صرف یہ کہ کس نے لکھا ہے۔ آخر کار اس کا پتہ چل گیا کہ مقالہ نگار کا نام "مختار الدین آرزو" ہے اور پھر اس کے بعد جو کچھ سید سلیمان ندوی کے حواریین نے کیا وہ ہر چند اس قابل نہیں کہ اسے کسی مہذب انسان کے سامنے بیان کیا جائے، لیکن اس خیال سے کہ آپ ان ندویوں کی ذہنیت سے بے خبر نہ رہیں پٹنہ کے دو اخباروں کا کچھ اقتباس پیش کیا جاتا ہے جن کے اڈیٹر دونگراں سب کے سب ماشاء اللہ ندوی

ہیں۔ ایک اخبار میں علامہ سید سلیمان ندوی کے شاگرد و حواری مولانا سید مسعود عالم ندوی کسی مستفسر کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مثال کے طور پر آپ اپنے پٹنہ کے اس کمسن نوجوان مختار الدین لڑکے کو سامنے رکھئے۔ آجکل آپ کے کسی حصہ میں کچھ گدگدی سی اٹھی ہوئی ہے۔ اس گدگداہٹ یا یوں سمجھئے اس شیطانی وسوسہ کو مٹانے کی آپ نے بڑی کوششیں کیں، مگر آپ جانتے ہیں کہ اس "معاملۂ خاص" میں ہمارا صوبہ بڑا ہی بدذوق واقع ہوا ہے، چنانچہ ہمارے اس ملیح و صبیح نوجوان کو اپنے وسوسہ کی تسکین کے لئے لکھنؤ کی طرف رجوع کرنا پڑا اور معلوم ہے کہ "لکھنؤ" اس "معاملۂ خاص" میں کافی سے زیادہ خوش ذوق واقع ہوا ہے۔ جہاں صرف بالید کا مضمون ہو اگر وہاں کوئی پوری رعنائی اور سامان کافری کے ساتھ اپنے کو پیش کر دے تو لکھنؤ والے مارے خوشی کے کھڑے کھڑے پیشاب کرنے لگیں تو اس میں بھلا ان کا کیا قصور ہے؟۔ اس بچہ کی خاص قسم کی پریشانی کا احساس کر کے ہم اسے مشورہ دینے والے ہی تھے کہ وہ لکھنؤ کی طرف رجوع کرے لیکن یہ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے پریشان حال معصوم نے اپنے مرض کا نسخہ خود ہی تجویز کر لیا اور نیاز کے گود میں جا پہونچے اور اپنی پریشان کن خواہش اور جان لیوا تشنگی کو دریائے گومتی کے پانی سے بجھانے لگے۔ زندہ باد لکھنؤ پائندہ باد آغوش نیاز۔ لیکن ہم اس بچہ کو آگاہ کرتے ہیں کہ یہ لکھنؤ والے بڑے مطلبی ہیں۔ جب تک جوبن باقی ہے سب کچھ کریں گے اور جہاں ڈھلنے ڈلنے کا قصہ آیا پھر کوئی نزدیک پھٹکنے نہیں دے گا"

اس مضمون کے بعد ہی علامہ ظفر بندہی کے کچھ اشعار نظر آتے ہیں جن کی سرخی "بے بھاؤ کی" ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

ہوا تیری عصمت کا مختار شیطاں، جو شہرت کا تو ہے طلبگار شیطاں
یہ گجّی سی آنکھیں، یہ نمکین چہرہ بنا چشم نرگس کا بیمار شیطاں

ایک دوسرے اخبار کے دوسرے ندوی اڈیٹر نے کسی اور مستفسر کا جواب دیتے ہوئے یوں خامہ فرسائی کی ہے:

"آپ کا نام مختار الدین اور غالباً آرزو تخلص، لمبا قد، گندمی رنگ، چہرے پر ملاحت اونچی ناک سرگیں آنکھیں مزید دو آنکھیں اور ہر بات سے بھولا پن، ہر ادا سے ناز و انداز نمایاں، کسی مدرسے کے ملا، برسوں نوکری اور ملازمت کی خاطر انسپکٹر آف اسکول اور مدرسوں کے ممتحنوں کے در کی جبیں سائی کرتے رہے لیکن ہر راہ مسدود اور ہر دروازہ بند پایا آخر مضمون نگاری اور شہرت آفرینی کی سوجھی اس سلسلے میں ہندوستان کی ایک برگزیدہ ہستی پر کیچڑ اچھالا ہے جس سے تہذیب و شائستگی آنکھیں بند کر لیں اور سننے والوں نے سر پیٹ لئے۔ یہ ہے آپ کی مختصر سرگزشت"

دیکھا آپ نے، یہ ہے ندویوں کی تہذیب اور یہ ہیں وہ ذلیل حربے جو سید سلیمان ندوی کے حواریین کی طرف سے استعمال کئے جاتے ہیں یہ لوگ ان اعتراضات کا جواب کبھی نہ دیں گے جو اُن کے مقالات یا مزعومات پر کئے جاتے ہیں بلکہ اپنی دل کی آگ صرف اسی قسم کی رکیک و ذلیل گالیوں سے بجھائیں گے جن کو آپ نے ان اقتباسات میں ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

یہاں مکارم نگر میں ایک میلہ "خواجہ سراؤں" کا ہوا کرتا تھا جس میں صرف گالیوں ہی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ لیکن اب غالباً یہ اعظم گڑھ کی طرف ہونے لگا ہے۔ اور بجائے زبان کے کاغذ و قلم کے ذریعہ سے اس کی نمائش ہوتی ہے!

میں مختار الدین احمد صاحب آرزو کو مشورہ دوں گا کہ وہ ان ہفوات کی مطلق پرواہ نہ کریں اور اپنے کام میں لگے رہیں۔ حاسدوں کی سزا یہی ہے کہ ان کی آتش حسد کو تیز تر کیا جائے اور اس کی بہترین صورت صرف یہ ہے کہ ان کے مزخرفات کی طرف توجہ نہ کی جائے

اذا مروا باللغو مروا کراما!

ہماری مشکلات

اس سے پہلے کاغذ کی گرانی و کمیابی کا ذکر کیا گیا تھا، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ کمیابی اب نایابی کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے اور نگار کے سایز کا کاغذ لکھنؤ کے بازار میں مفقود ہے ۔ ہندوستان کے کاغذ ساز کارخانوں کو اول تو حکومت کی فرمایش پوری کرنے سے وقت نہیں ملتا اور اگر کچھ فرصت ملتی بھی ہے تو وہ بھاری کاغذ طیار کرتے ہیں تاکہ وہ کم از کم محنت سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرسکیں، فی الحال تو کئی مہینے کے لئے میں نے کسی نہ کسی طرح انتظام کرلیا ہے، لیکن اگر بعد کو اس سایز کا کاغذ نہ ملا تو شاید تقطیع بدلنا پڑے گی ۔

اس مرتبہ قیدک ([illegible]) کا کاغذ بھی نہیں ملا، اس لئے مجبوراً سرورق ہی کے ایک طرف پتہ لکھ کر پرچہ پوسٹ کیا جاتا ہے ۔ سرورق کا کاغذ جو پہلے سات روپیہ فی رم کے حساب سے آتا تھا اب اس کی قیمت بیس روپیہ سے زیادہ ہے اور پھر بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا ۔ اس لئے سرورق بھی اُسی کاغذ کا رکھا گیا جس پر رسالہ چھپتا ہے ۔

یورپ میں تو خیر لڑائی کی وجہ سے ہر چیز کا راشن مقرر ہے، لیکن ہندوستان میں یہ تجربہ کاغذ سے شروع ہوتا ہے ۔ خدا خیر کرے! میں نے اپنی ان دشواریوں کا ذکر اس لئے کیا کہ اگر اس موقعہ پر قارئین نگار نے توسیع اشاعت میں حصہ لیا تو یہ ان کی انتہائی فرض شناسی ہوگی ۔ لیکن اگر انھوں نے اس طرف توجہ نہ کی، تو بھی نگار تو بہر حال کسی نہ کسی طرح جاری ہی رہے گا اور اُنھیں معنوی خصوصیات کے ساتھ جو اس کے لئے مخصوص ہیں ۔ ظاہری صورت اگر کچھ بگڑی ہوئی نظر آئے تو اس کی پرواہ نہ کیجئے، کیونکہ حُسن صورت کا دعویٰ نگار نے کبھی نہیں کیا اور نہ آپ نے نگار کو "بک اسٹال" والا رسالہ سمجھکر کبھی اسے خریدا !

رفتارِ جنگ

لڑائی کو شروع ہوئے انیس مہینے ہوچکے ہیں، لیکن ابھی تک کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کب تک جاری رہے گی اور اس کا انجام کیا ہوگا ۔ گتھی پر گتھی پڑتی جارہی ہے اور فریقین میں سے کوئی اگر کسی گرہ کو کھولتا بھی ہے تو چار اور نئی گرہیں پڑجاتی ہیں ۔

خبریں جو کچھ مل رہی ہیں وہ اس قسم کی ہیں کہ خود خبریں بھیجنے والوں کو بھی ان پر یقین نہیں اور اگر اگلے پچھلے حالات کو سامنے رکھکر قیاس سے کام لینے کی کوشش کیجئے تو اتنی متضاد باتیں نظر آتی ہیں کہ نتیجہ تو خیر بڑی چیز ہے، ہم درمیانی منزلوں کو بھی متعین نہیں کرسکتے ۔

اس وقت تک جو کچھ ہوچکا ہے اس نے دو باتیں بیشک پوری طرح واضح کردی ہیں، ایک یہ کہ ناتسی سیلاب آگے بڑھتے بڑھتے رُک گیا ہے اور دوسرے یہ کہ انگلستان نے جو بند اس سیلاب کے روکنے کے لئے قایم کیا تھا، اس میں کوئی رخنہ ابتک پیدا نہیں ہوا ۔

جیسا کہ خیال تھا، موسم بہار کے آغاز سے جرمنی نے انگلستان پر بھی ہوائی حملوں کا سلسلہ شدت کے ساتھ شروع کردیا ہے اور بحر اٹلانٹک میں بھی اس کی آبدوز کشتیاں زیادہ سرگرمی دکھانے لگی ہیں، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جرمنی خود بھی ان حملوں کی طرف سے زیادہ مطمئن نہیں ہے اور وہ بلقان کی ریاستوں کو ملاکر، یونان کی طرف سے انگریزی مقبوضات اور نہر سویز پر بھی حملہ کرنا چاہتا ہے ہنگری تو بہت پہلے اس کا شریک ہوچکا تھا لیکن اب رومانیا اور بلغاریا بھی اس کے ساتھ ہوگئے ہیں ۔ یوگوسلیویا کا مسئلہ البتہ ابتک اُلجھا ہوا ہے اور وہاں ایک تازہ تحریک جرمنی کے خلاف پیدا ہوچلی ہے ۔ اگر یوگوسلیویا نے واقعی جرمنی کا ساتھ دینے سے انکار کردیا تو بلقان کی موجودہ سیاست پر اس کا بہت بڑا اثر پڑے گا ۔ جس حکومت نے جرمنی کے ساتھ معاہدہ کیا تھا وہ ختم ہوچکی ہے اور وہاں کے نوجوان بادشاہ نے اعلان کردیا ہے کہ وہ بالکل غیر جانبدار رہے گا ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اب نہ جرمن فوجیں یوگوسلیویا کی طرف سے یونان پر حملہ کرسکیں گی اور نہ بحر اڈریاٹک پر اقتدار حاصل کرکے جرمنی اور اٹلی کی سرحدیں ایکدوسرے

سے مل سکیں گی۔

یہ گوسلیویا کی جائے وقوع ایسی ہے کہ وہاں سے خشکی اور سمندر دونوں طرف سے یونان اور بحر روم کی طرف فوجیں بھیجی جا سکتی ہیں اور کھانے پینے کی چیزیں بھی جرمنی کو حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اگر یوگوسلیویا واقعی اپنی ناطرفداری پر قایم رہا تو ہٹلر کے لئے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا تو وہ زبردستی اپنی فوجیں یوگوسلیویا کے اندر سے لیجائے، یا پھر صرف بلغاریا کے راستہ سے یونان پر حملہ کرے۔

اول صورت میں جرمنی کو ایک اور سخت لڑائی مول لینا پڑے گی، کیونکہ یوگوسلیویا کو برطانیہ اور امریکہ کی طرف سے بھی پوری مدد ملیگی اور چونکہ یہاں کی سرزمین بالکل کوہستانی ہے، اس لئے اگر ہٹلر کو کامیابی حاصل ہوئی بھی تو مہینوں درکار ہوں گے، لیکن اگر اس نے یوگوسلیویا کو نہ چھیڑا اور بلغاریا ہی کی طرف سے حملہ کیا تو اسے ترکی اور یوگوسلیویا دو ناطرفدار حکومتوں کے درمیان سے گزرنا پڑے گا، جو خطرہ سے خالی نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بلقانی ریاستوں میں کبھی اتحاد نہیں پایا گیا اور اسی وجہ سے وہ دوسری حکومتوں کا شکار بنی رہیں، لیکن یونان، ترکی اور یوگوسلیویا کا باہمی معاہدہ زیادہ قوی اغراض پر قایم ہے اور ہو سکتا ہے کہ آیندہ صورتیں ایسی پیدا ہو جائیں کہ ان تینوں کو جرمنی کے مقابلہ میں آجانا پڑے اور یہ بات ہٹلر کے اغراض کے بہت منافی ہوگی۔

ہٹلر نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ بلقان میں لڑائی کی آگ بھڑک پڑے، کیونکہ اول تو اس سے روس کی موجودہ پالیسی پر برا اثر پڑے گا، دوسرے یہ کہ فتنہ و فساد کے زمانہ میں وہ بلقان سے اقتصادی فواید حاصل نہ کر سکے گا۔ اس لئے اس کی امید بہت کم ہے کہ وہ یوگوسلیویا سے لڑائی مول لیگا، لیکن یونان پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دے، وہ یہ بھی نہ کرے گا، کیونکہ اس سے اس کے اقتدار کو بہت صدمہ پہونچے گا اور بلقان میں اس کی سیاسی کامیابی ختم ہو جائے گی۔

بہرحال حالات آہستہ آہستہ جرمنی کے ناموافق ہوتے جا رہے ہیں اور جتنا زمانہ گزرتا جائے گا یہ نامساعدت بڑھتی ہی جائے گی کیونکہ جرمنی یلغار کر کے تو کامیابی حاصل کر سکتا ہے، لیکن اس کی اقتصادی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ جنگ کے مصارف کو زیادہ عرصہ تک برداشت کر سکے۔

یہ جنگ یقیناً کسی نہ کسی وقت ختم ہوگی، لیکن اس میں فتح و شکست کا سوال کوئی پیدا نہ ہوگا، اس لڑائی کا نتیجہ انقلاب ہے، خواہ جرمنی میں ہو انگلستان میں۔ پچھلی لڑائی میں بھی جرمنی کو شکست نہیں ہوئی تھی، بلکہ ملک کے اندرونی انقلاب نے اسے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی صورت اس مرتبہ بھی پیدا ہوتی نظر آتی ہے، کیونکہ باوجود اتنے ممالک پر قابض ہو جانے کے سمندر کے راستے اس پر بدستور بند ہیں اور اس ناکہ بندی کے سامنے اُسے جلد یا بدیر ضرور سپر ڈالنا پڑے گی۔

وہ خود بھی انگلستان کی ناکہ بندی کرنا چاہتا ہے اور بحر اٹلانٹک میں اس کی آبدوز کشتیوں کا مقصود یہی ہے کہ باہر سے کوئی مال انگلستان میں نہ آنے پائے، لیکن وہ ابتک اس میں کامیاب نہیں ہوا۔

انگریزی جہازوں کا اس میں شک نہیں کافی نقصان ہو رہا ہے، لیکن برطانیہ کے بحری ذرایع اتنے وسیع ہیں کہ وہ اس نقصان کو عرصہ تک برداشت کر سکتا ہے اور یہی اس کی بڑی جیت ہے۔

جاپان، جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں، جنگ کا رُخ دیکھ رہا ہے اور مشرق میں اس کی پالیسی ہٹلر کی کامیابی و ناکامی کے ساتھ ساتھ چلے گی، اگر جرمنی، یونان پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو خیر، ورنہ جاپان برما یا ہندوستان کی طرف کوئی اقدام نہ کرے گا۔

بہت سے جھوٹ جو سچ سمجھ لئے گئے ہیں

دُنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جن کو بالاتفاق سب نے صحیح تسلیم کرلیا ہے، حالانکہ حقیقت میں ان کی کوئی اصلیت نہیں اور لطف یہ ہے کہ اگر آپ ان کو غلط بتائیں تو دُنیا آپ کو جاہل سمجھے۔ ان جھوٹ حقیقتوں کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں :-

(۱) عام طور پر ہر شخص سمجھتا ہے اور پورے یقین کے ساتھ سمجھتا ہے کہ چھونے اور سننے کا احساس اندھے میں بہت قوی ہوجاتا ہے اور اس کی بینائی کی قوت دوسری طرف صرف ہونے لگتی ہے، لیکن یہ بالکل غلط ہے — سر فرانسیس گالٹن نے جو علم وراثت کے ماہر ہیں، اندھوں کے مدرسہ میں طویل تجربہ کے بعد اس خیال کو غلط ثابت کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اندھوں میں چھونے یا سننے کی حس آنکھ والوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔

علاوہ سر فرانسیس کے دوسرے ماہرین نے بھی اس کی تحقیق کی ہے اور اُن سب نے متفقہ طور پر اس خیال کی تردید کی ہے، بلکہ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ اندھوں کے دوسرے احساسات بھی کمزور ہوجاتے ہیں کیونکہ اندھے پن سے جو اضطراب اعصاب میں پیدا ہوتا ہے اس کا اثر دوسرے حواس پر بھی پڑتا ہے۔

(۲) یہ بات بھی بہت مشہور ہے کہ بجلی کی روشنی آنکھوں کے لئے نقصان رساں ہے لیکن اس کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ بجلی کی روشنی یقیناً آفتاب کی روشنی سے زیادہ نہیں اس لئے اگر آفتاب کی روشنی آنکھوں کے لئے مضرت کی چیز نہیں تو بجلی کی روشنی بدرجۂ اولیٰ نقصان رساں نہیں ہوسکتی۔ البتہ روشنی کی طرف دیکھتے رہنا بیشک نقصان کی بات ہے سو اس میں بجلی اور آفتاب دونوں برابر ہیں۔

(۳) عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ جس کو کتا کاٹ لیتا ہے وہ پانی سے ڈرنے لگتا ہے اور اسی لئے وہ تالاب یا دریا کے پاس نہیں جاتا، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ ایسے مریض پر اکثر اعصابی تشنج کے دورے پڑتے ہیں اور اسی تشنج کی وجہ سے وہ پانی پیتے ڈرتا ہے ورنہ پانی سے اس کو ڈر نہیں لگتا۔

(۴) درندوں کے سدھانے والوں کے متعلق خیال ہے کہ یہ نتیجہ ہے مقناطیسی قوت کا جو سدھانے والوں کی نگاہ میں پائی جاتی ہے اور جسوقت یہ قوت کم ہوجاتی ہے تو حیوان کی اطاعت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ خیال بھی غلط ہے۔ فی الاصل جانور ڈرتا ہے مار سے اور شروع سے اس کو مار مار کر اتنا ڈرا دیا جاتا ہے کہ وہ سدھانے والے کے ہر اشارہ پر چلنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر اس کے خلاف کیا تو سخت سزا برداشت کرنا پڑے گی۔ اس میں قوت مقناطیسی کو کوئی دخل نہیں۔

(۵) لوگوں کو یقین ہے کہ جب کوئی شخص کسی بلند جگہ سے گرتا ہے تو زمین تک پہونچنے سے پہلے ہی اس کا دم نکل جاتا ہے، کیونکہ گرنے کی تیزی اس کو سانس لینے کا موقعہ نہیں دیتی۔ لیکن اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ واقعات و تجربات بتاتے ہیں کہ لوگ

بڑے بڑے بلند مقام سے گرنے کے بعد بھی زندہ رہے۔ ایک شخص غبارہ سے گرا جو ۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اُڑ رہا تھا، لیکن زمین پر آنے سے پہلے ہی اس نے چھتری کھولی اور آہستگی سے اُترنے لگا۔ اب ہوائی جہازوں سے عام طور پر لوگ نیچے کودتے ہیں اور نہایت تیزی کے ساتھ نیچے آتے ہیں لیکن کسی کو ضرر نہیں پہونچتا۔

گرنے کی تیزی کی وجہ سے سانس نہ لے سکنے کا خیال بھی غلط ہے، کیونکہ انسان بلندی سے جب گرتا ہے تو اس کی رفتار سوفٹ فی سکنڈ ہوتی ہے اور یہ ثابت ہے کہ انسان ایک منٹ تک آسانی سے اپنی سانس روک سکتا ہے چہ جائیکہ دس بارہ سکنڈ الغرض گرنے کی حالت میں سانس رُکنے یا نہ لے سکنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۶) مشہور ہے کہ اگر سانپ کو مارو تو سورج ڈوبنے تک اس کی روح نہیں نکلتی، اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ سانپ کے جسم میں اور دوسرے جانوروں کی طرح مرنے کے بعد بھی حرارت عرصہ تک باقی رہتی ہے اور اس کا جسم پھڑکتا رہتا ہے، چنانچہ ہوسکتا ہے کہ سہ پہر کے وقت سانپ کو مارا جائے اور شام تک اس کا جسم ٹھنڈا نہ ہو۔ لیکن اس میں سانپ کی کوئی خصوصیت نہیں اور بھی بعض جانور ایسے ہیں جو بہت دیر میں ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

(۷) مشہور ہے کہ سانپ جب کاٹتا ہے تو اس کی دُم کا ایک حصہ جھڑ جاتا ہے، چنانچہ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ بنڈا (دُم جھڑا ہوا) سانپ بڑا ظالم ہوتا ہے، کیونکہ یہ علامت ہے اس بات کی وہ بہت سے آدمیوں کو کاٹ چکا ہے۔

یہ عقیدہ بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض قسمیں سانپوں کی ایسی ہیں، جن کی دُم جھڑتی ہے اور پھر نکلتی ہے۔ البتہ جب وہ بڈھے ہوجاتے ہیں تو نشو ونما کی قوت ضعیف ہونے کی وجہ سے دُم جھڑنے کے بعد مشکل سے نکلتی ہے یا نکلتی ہی نہیں — اس کا تعلق کاٹنے یا نہ کاٹنے سے بالکل نہیں ہے۔

(۸) شترمرغ کے متعلق دو باتیں بہت مشہور ہیں ایک یہ کہ وہ لوہے کا ٹکڑا نگل کر ہضم کرلیتا ہے اور دوسرے یہ کہ خطرہ کے وقت اپنا سر ریت کے اندر چھپا لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب میں محفوظ ہوں۔ لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ وہ پتھر کا ٹکڑا تو بیشک ہضم کرسکتا ہے، لیکن لوہا ہضم نہیں کرسکتا، لوہے کے ٹکڑے کو پتھر سمجھ کر کھا جانا تو ممکن ہے لیکن یہ اس کو اُگلنا پڑتا ہے۔

ریت کے اندر سر چھپا لینے کی تصدیق بھی ان شکاریوں سے نہیں ہوتی جنھوں نے برسوں افریقہ کے جنگلوں میں صرف کئے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہوتا تو آج شترمرغ کی نسل مفقود ہوگئی ہوتی کیونکہ شکاری اور درندے ہمیشہ ان کی فکر میں رہتے ہیں اور ریت میں سر چھپانے کے بعد اس کا شکار اور زیادہ آسان ہوجاتا ہے۔

(۹) مشہور ہے کہ صحراء اعظم کی ریت لہریں لیتی ہے۔ حالانکہ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہوا کی وجہ سے صحرا کی ریت پر موجوں کے سے نشان نظر آنے لگتے ہیں لیکن خود ریت میں کوئی موج پیدا نہیں ہوتی۔

یہ بھی مشہور ہے کہ چوربالو (Quick Sand) اپنے اندر کھینچ لیتی ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اس ریت میں کافی تری ہوتی ہے اور اس پر چلنے کے بعد انسان اپنا توازن قایم نہیں رکھ سکتا اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے۔ خود بالو میں کوئی کشش نہیں ہے۔

(۱۰) لوگوں کو یقین ہے کہ اٹلانٹک سمندر کے جنوب میں سمندر کا ایک حصہ ہے جسے "بحر سارگاسو" کہتے ہیں اور جب کشتیاں

اس کے قریب پہونچتی ہیں تو وہ اپنے اندر کھینچ کر انھیں ڈبو دیتا ہے۔ لیکن یہ صرف خیال ہی خیال ہے اور آج تک کوئی واقعہ ایسا پیش نہیں آیا حالانکہ اٹلانٹک کا کوئی حصہ ایسا نہیں، جہاں جہاز نہ گئے ہوں۔

(۱۱) اب ایک تاریخی جھوٹ ملاحظہ ہو:۔ مشہور ہے کہ سب سے پہلے امریکہ کو کولمبس نے دریافت کیا، حالانکہ وہاں کے قدیم باشندوں کے آباو اجداد نے کولمبس سے بہت پہلے اسے دریافت کر لیا تھا۔

(۱۲) دوسرا تاریخی جھوٹ جس پر فسانے کے فسانے لکھے جا چکے ہیں، یہ ہے کہ جس وقت شہر روما آگ میں جل رہا تھا تو بادشاہ نیرو بربط بجا رہا تھا۔

روما میں آگ کا پھیل جانا درست ہے لیکن ایسے وقت میں نیرو کا ساز چھیڑ دینا صحیح نہیں۔ چونکہ یہ عیسائیوں کا سخت دشمن تھا اس لئے انھوں نے اپنے لٹریچر اور تصویروں کے ذریعہ سے یہ پروپاگنڈا اس کے خلاف کیا۔

(۱۳) کہتے ہیں کہ انسان کے دانت میں جانور کے دانتوں سے زیادہ زہر ہے، لیکن اس میں کوئی حقیقت نہیں، بات یہ ہے کہ دانت کے زخم سے جراثیم پیدا ہو جانے کا اندیشہ ضرور ہے، خواہ وہ دانت انسان کے ہوں یا حیوان کے، لیکن یہ کہنا کہ انسان کے دانت میں جانور کے دانتوں سے زیادہ زہر ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔

(۱۴) ایک عقیدہ یہ ہے کہ جب عورت حاملہ ہوتی ہے اور وہ کسی چیز سے ڈرتی ہے تو بچہ کے جسم پر اس کا نشان بن جاتا ہے اسی طرح یہ بھی مشہور ہے کہ موتیں زیادہ تر نصف شب کے بعد ہوتی ہیں، کانچ کے متعلق مشہور ہے کہ اگر نگل لیا جائے تو وہ زہر ہو جاتا ہے، اور بجلی کی بابت کہا جاتا ہے کہ ایک مکان پر دو مرتبہ نہیں گرتی۔ یہ تمام باتیں غلط ہیں اور صرف واہمہ کی پیداوار۔

مکتوبات نیاز کا دوسرا حصہ

زیر ترتیب ہے اور اس کا حجم پہلے حصہ سے زیادہ ہے۔ جو حضرات ابھی سے اپنا نام درج رجسٹر کرالیں گے، اُن سے محصولڈاک نہیں لیا جائے گا۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ آٹھ آنے ہوگی۔

ترغیبات جنسی کا دوسرا اڈیشن بھی نظر ثانی کے بعد زیر کتابت ہے۔

تذکرۂ معرکۂ سخن اپنے رنگ کا بالکل پہلا تذکرہ جس میں بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے اساتذہ کے کلام پر کیا کیا اعتراض کئے گئے اور یہ کہ ان کا کوئی جواب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ تذکرہ انتہائی کاوش کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور فن شعر کے متعلق بے بہا معلومات کا ذخیرہ ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ۔ مینیجر نگار لکھنؤ

نگار کے حسب ذیل پرچے قیمتاً مطلوب ہیں

نومبر ۲۲ء - مارچ، اپریل، اگست و ستمبر ۲۳ء۔
فروری - اپریل - جولائی - اگست - اکتوبر - دسمبر ۲۵ء۔
مارچ - اپریل - مئی - ستمبر و دسمبر ۲۶ء۔
فروری - جولائی - اگست - ستمبر - اکتوبر - نومبر - دسمبر ۲۷ء۔
جنوری - فروری - اپریل - مئی - اکتوبر - نومبر و دسمبر ۲۸ء۔
ستمبر ۲۹ء - اپریل ۳۱ء - اگست ۳۳ء۔
نومبر ۳۶ء - ستمبر ۳۷ء - اگست - اکتوبر ۳۹ء

جو صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں، براہ کرم اس پتہ سے خط و کتابت کریں

مولوی عبدالرؤف، بی۔ اے۔ ڈپٹی کلکٹر
الہ آباد

تاریخ اودھ کا ایک ورق

(بادشاہ بیگم)

مولوی عبدالاحد[1] بن محمد فائق ساکن ایٹھی نے لفٹنٹ جان ڈاوٹن کی ہدایت پر جو دربار اودھ میں کمپنی کے نمایندہ تھے۔ بادشاہ بیگم کے سوانح حیات مرتب کئے تھے[2] جو عرصہ سے غائب تھے۔ حسن اتفاق سے میرے عزیز دوست و ہم وطن مسٹر تقی احمد علوی کانپوری کو بسلسلۂ ملازمت مہاراجہ بلرام پور کے ذاتی کتب خانہ دیکھنے کا موقعہ ملا تو وہاں انھیں اس کتاب کا ایک نسخہ نظر آیا اور اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں شایع کیا۔ یہ مقالہ اسی نسخہ سے اخذ و اقتباس کا نتیجہ ہے۔

آصف الدولہ کے عہد میں، سعادت علی خان نے لکھنؤ کے قیام کو پسند نہ کیا، کیونکہ اُن کو اپنے ارادوں میں کامیابی نہیں ہوئی تھی، وہ پہلے شاہجہاں آباد گئے اور پھر بنارس چلے گئے۔ اتفاقاً مبشر خاں (منجم الملک) خلف مشرف خاں شاگرد خیر اللہ منجم رصدگاہ (محمد شاہی) بھی اسی زمانہ میں بنارس آئے اور سعادت خاں سے ملاقات ہوئی۔ مبشر خاں کی ایک لڑکی تھی جس سے وہ بہت محبت کرتے تھے اور جس کو انھوں نے نجوم کی علمی و نظری تعلیم بھی دی تھی۔ وہ نسباً سادات رضوی تھے اور بڑے بلند مرتبہ کے انسان سمجھے جاتے تھے۔ سعادت علی خاں نے اپنے صاحبزادہ غازی الدین حیدر کی شادی کے لئے منجم الملک کو ان کی صاحبزادی بادشاہ بیگم کے لئے پیام دیا۔

منجم الملک نے اس پیام کو اپنے خاندانی وقار کے خلاف تصور کیا لیکن بمصلحت انکار نہ کرسکے اور بہت غور کے بعد اس پیام کو منظور کرلیا۔ نواب سعادت علی خاں نے ۹۵-۱۷۹۴ء / ۹-۱۲۰۹ھ میں اپنے بیٹے غازی الدین سے شاہانہ کروفر سے بادشاہ بیگم کی شادی کی اور کچھ عرصہ کے بعد ایک لڑکی پوتی بیگم پیدا ہوئی۔ جو نواب علی مہدی خاں (توپ دروازہ) سے بیاہی گئیں اور اس صاحبزادی سے ایک صاحبزادہ محسن الدولہ اور دو صاحبزادیاں وزیر بیگم اور حاجی بیگم پیدا ہوئیں۔ محسن الدولہ کی شادی محمد علی شاہ کی صاحبزادی سے ہوئی، اور دونوں صاحبزادیاں ابوطالب خاں کے صاحبزادوں سے بیاہی گئیں۔

بادشاہ بیگم کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ غازی الدین حیدر نے بادشاہ بیگم کی ایک خواص صبح دولت سے دلچسپی لینا

---

[1] عبدالاحد مولوی محمد فائق کے صاحبزادہ ایٹھی کے باشندہ تھے۔ انھوں نے فارسی اپنے والد سے اور عربی فرنگی محل میں حاصل کی۔ وہ رزیڈنٹ لکھنؤ کے دفتر میں سررشتہ دار تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور نثار بھی۔ ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء میں اُن کا انتقال ہوا۔ ایٹھی میں مدفون ہیں۔ اُن کے اعزہ ابھی ایٹھی میں موجود ہیں لیکن اس تاریخ کا نسخہ اُن کے پاس نہیں ہے۔ [2] "وقایع دلپذیر عبدالاحد" اس کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے اس کتاب کی تکمیل کی تاریخ ۱۲۰۵ھ نکلتی ہے

شروع کی اور ۲۴ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ کو ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ بادشاہ بیگم کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بہت برہم ہوئیں اور کہا جاتا ہے کہ صبح دولت نہایت بیدردی سے قتل کردی گئی اور جھانکڑ باغ میں دفن ہوئی۔

بادشاہ بیگم نے اس نومولود کو بھی قتل کرنا چاہا تو (میر فضل علی کی خالہ) فیض النسا بیگم نے (جو محل شاہی میں مغلانی کے عہدہ پر فایز تھیں) بڑی مشکل سے بادشاہ بیگم کو اس جرم سے باز رکھا۔ اس نومولود کا نام نصیر الدین حیدر رکھا گیا جس سے بادشاہ بیگم کو غیر معمولی محبت پیدا ہوگئی۔

بادشاہ بیگم گو بہت پرہیزگار تھیں، لیکن مذہبی مراسم میں اختراعات کرنا اُن کی عادت میں داخل تھا، وہ بہت آشفتہ مزاج اور ضدی تھیں، یہاں تک کہ ان کی ضد اور غصہ ضرب المثل ہوگیا تھا اور غازی الدین حیدر کو اُن کے خلاف عمل کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مذہبی مراسم میں ان کے اختراعات یہ تھے:

چھٹی یہ رسم امام مہدی کے چھٹی کی یاد کو تازہ کرتی تھی۔ یہ رسم خالص ہندوستانی تھی، زچہ بچہ کو پیدائش کے چھٹے دن غسل دیا جاتا ہے تمام اعزہ و اقربا کو دعوت دی جاتی ہے، ناچ رنگ ہوتا ہے اور زچہ کو نئے اور قیمتی کپڑوں سے سنوارا جاتا ہے، یہ رسم محل شاہی کے اندر شعبان کے مہینے میں ہوتی تھی۔ اس رسم میں بہت کافی روپیہ خرچ کیا جاتا تھا۔

اچھوتی گیارہ قبول صورت سید لڑکیاں محل میں رکھی گئی تھیں اور گیارہ اماموں کی بیویاں کہلاتی تھیں۔ ان لڑکیوں کے حاصل کرنے کے لئے والدین کو بڑی رقمیں دیجاتی تھیں اگر والدین خوشی سے ان مطلوبہ لڑکیوں کو نہ دیتے تھے تو دیگر ذرایع سے بھی اُنکے حاصل کرنے کی سعی کی جاتی تھی، ہر لڑکی کا نام اصل امام کی بیوی کے نام پر رکھا جاتا تھا اور یہ اچھوتی کہلاتی تھیں۔ احترام کی نظر سے، حضرت فاطمہؑ، حضرت علیؑ اور دیگر اہل بیت کے نام سے کوئی ہستی نامزد نہ کی جاتی تھی۔ ہر اچھوتی کے پاس تین خادمائیں ہوتی تھیں جب بادشاہ بیگم خواب سے بیدار ہوتیں تو آنکھ کھلتے ہی وہ کسی اچھوتی کی زیارت ضرور کرتی تھیں، بیگم اس جماعت کا بڑا احترام کرتی تھیں۔ اور جب کسی اچھوتی سے نظریں چار ہوجاتی تھیں تو تعظیماً جھک جایا کرتی تھیں۔ بیگم اچھوتیوں کی ہر خواہش کو پورا کرنا فرض سمجھتی تھیں لیکن بایں ہمہ ان کی شادی کی خواہش کو پورا نہ کرتی تھیں۔ کیونکہ اُن کا عقیدہ تھا کہ جو لڑکیاں اپنی زندگی کو اس مقدس مقصد پر بھینٹ چڑھا چکی ہوں اُن کو شادی کا خیال ہی نہ کرنا چاہئے۔

ایک اچھوتی نے جذبات پر قادر نہ رہ کر گلوخلاصی کی ایک عجیب ترکیب نکالی۔ ایک شب وہ دفعتاً رونے لگی اور آہ و بکا سے محل میں ایک ہنگامہ برپا کردیا، سب لوگ جاگ اُٹھے، بیگم کو بھی اطلاع ہوئی وہ گھبرا کر بیدار ہوئیں اور واقعات کی تحقیق شروع کردی اُس اچھوتی نے رو رو کر بیان کیا کہ خواب میں امام کی زیارت ہوئی وہ بہت غصہ معلوم ہوتے تھے۔ آخر کار انھوں نے اس کنیز کو طلاق دیدی"۔ بادشاہ بیگم نے اُسی وقت عزت و احترام کے ساتھ اُس کے والدین کے گھر بھیجدیا۔

اچھوتے تیسری اختراع یہ تھی کہ ایک مخصوص کمرہ میں گیارہ لڑکے رکھے جاتے تھے اور یہ امام کہلاتے تھے، ہر امام کی پیدائش کے دن وہ کمرہ کھولا جاتا تھا اور بادشاہ بیگم بذات خود جھک کر نذریں پیش کرتی تھیں اور اُس اچھوتی کو جو اُس امام کی بیوی نامزد ہوتی تھیں بیش قیمت جواہرات اور ملبوسات عطا کئے جاتے تھے۔

روضہ دوازدہ امام محل شاہی میں بادشاہ بیگم نے بارہ اماموں کا مقبرہ بھی طیار کرایا تھا اُس میں ایک مختصر مسجد بھی تھی اور یہ مقبرہ "روضۂ دوازدہ امام" کے نام سے موسوم تھا، ہر مزار پر ایک ضریح بھی ہوتی تھی جو کہا جاتا ہے کہ

اصل مزار کی نقل تھی اور اسی روضہ کے قریب ایک دوسری عمارت تعمیر کی گئی تھی جو مزار حضرت عباس کی نقل تھی۔

بادشاہ بیگم شب و روز نماز و وظایف میں مصروف رہتی تھیں۔ فاتحہ، درود، نذر، حاضری، اور خیر خیرات میں لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا تھا۔ بادشاہ بیگم ان باتوں کو دنیاوی اور اُخروی فلاح و نجات کا ذریعہ سمجھتی تھیں۔

آسیب بادشاہ بیگم کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ شاہ جنات اُن کے پاس آتا ہے۔ چنانچہ شاہ جنات کی آمد پر بہت بیش قیمت لباس اور زیورات سے مرصع ہوتی تھیں اور ایک پاک و صاف تخت پر خاموش بیٹھ جاتی تھیں۔ ڈومنیاں موسیقی چھیڑتی تھیں اور خود بیگم آسیب زدہ کی طرح اپنا سر ہلاتی تھیں۔

یہ تھی وہ فضا جس میں نصیر الدین حیدر شاہ نے نشو نما پائی تھی، چنانچہ وہ بھی فرایض خمسہ کے مقابلہ میں ان مراسم پر زیادہ توجہ کرتے تھے۔ اور بادشاہ بیگم سے تعلقات خراب ہونے کے بعد بھی وہ ان مراسم کے پابند تھے بلکہ انھوں نے چند اور رسوم کا اضافہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے بارہ اماموں کے علاوہ حضرت قاسم اور حضرت عباس کی بیویاں بھی نامزد کیں۔ ہر امام کی پیدائش کے دن بادشاہ خود عورتوں کی طرح زچگی کی تکالیف برداشت کرنے کی نقل ادا کرتے تھے۔ یہ تمثیل پورے مذہبی جوش سے ادا کی جاتی تھی ایک گڑیا جواہرات سے مرصع بادشاہ کی بغل میں لٹا دی جاتی تھی اور مصاحبین بادشاہ کو اپنی مخصوص اغذیہ اس زمانہ میں کھلاتے تھے جو عام عورتوں کو اس زمانے میں دی جاتی تھیں۔ چھٹے دن بادشاہ عورتوں کی طرح غسل کرتا تھا۔ ایک خواص بچہ کو ایک کونہ میں کھڑا کر دیتی تھی۔ دوسری خواص چند گھڑے پانی بادشاہ سلامت پر ڈالتی تھی۔ اس طرح سے رسم غسل ادا ہوتی تھی۔ شب کو بادشاہ بیش قیمت زنانی پوشاک پہنکر بچے کے ساتھ صحن میں جاتے تھے اور ستارہ دیکھنے کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ جب مراسم ادا ہو جاتے تھے تو وہ فرضی بچہ ایک خوبصورت مرصع کھٹولے پر لٹا دیا جاتا تھا اور نذریں پیش کی جاتی تھیں۔ عمدہ عمدہ نفیس کھانے تقسیم ہوتے تھے اور خصوصیت سے اُس خواص کو گراں بہا انعامات سے سرفراز کیا جاتا تھا جو اس "زچگی" کی حالت میں بادشاہ سلامت کے ساتھ رہتی تھی۔ بارہ اماموں کی نامزد شدہ بیویوں کو طلائی گڑیا دی جاتی تھیں اور دیگر مذہبی رہنماؤں کی بیویوں کو چاندی کی گڑیا عطا ہوتی تھی۔ اماموں کی ایام پیدائش کے علاوہ دیگر مذہبی افراد کی پیدائش کے دنوں میں بھی اسی قسم کی رسمیں حرم شاہی میں ادا کی جاتی تھیں۔

زچگی کی میعاد مقرر نہ تھی ایک ہفتہ سے دس دن تک یہ میعاد سمجھی جاتی تھی۔ جب زچگی کا وقت ختم ہو جاتا تھا تو بادشاہ سلامت پردہ سے باہر تشریف لاتے تھے اور بیش قیمت زنانہ لباس پہن کر ایک مرصع پالکی میں ہوا خوری کو نکلتے تھے۔ پالکی کے ساتھ تمام شاہی ساز و سامان ہوتا تھا اور مختلف خوش ذائقہ مٹھائیوں سے بھرے ہوئے خوان ساتھ ہوتے تھے۔ یہ رسم اس قدر مقبول ہو گئی تھی کہ شہر کی بہت سی عورتیں اپنے آپ کو "اچھوتیاں" کہلانا پسند کرتی تھیں اور اُن کے مردوں نے مردانہ عادات ترک کر کے زنانہ لباس اور انداز گفتگو اختیار کر لیا تھا

یہی نہیں بلکہ اماموں کی شادی کی تاریخیں اسلامی روایات سے تلاش کر کے ساچق اور حنا بندی کی رسمیں بھی اس میں شامل کی گئیں، ایک خاص خواص کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ پہلی محرم کو ہر سال حضرت فاطمہ کی شادی رچائی جاتی تھی، اُس دن ایک زرکار بستر پر حضرت فاطمہ و حضرت علی کے مجسمے بٹھائے جاتے تھے، رسم نکاح ادا ہوتی تھی، لوگ بہ نظر احترام صف بستہ استادہ رہتے تھے۔ نکاح کے بعد نظریں پیش کی جاتی تھیں، بعدہ ان خواتین کو جو وہاں موجود ہوتی تھیں بہترین کھانے اور مٹھائیاں تقسیم کی جاتی تھیں اور فاتحہ خوانی ہوتی تھی۔ مصنف لکھتا ہے کہ ان بدعتوں کو دیکھ کر خدا کے غضب سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے لیکن کسی کی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ شاہی جذبات کے احترام کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکتا۔

بادشاہ نے بھی بادشاہ بیگم کی تقلید میں فرح بخش کے قریب بارہ مقبرے تعمیر کئے جس میں قبر کے ساتھ ضریح اور ایک چھوٹی مسجد بھی تھی۔ حضرت عباس کے روضہ کی شبیہ لوہے کی بنائی گئی تھی۔ یہ مقبرے بادشاہ بیگم کے مقبروں سے زیادہ آراستہ و پیراستہ تھے کیونکہ بادشاہ سمجھتے تھے کہ ان مقبروں کا وجود ان کی بہبودی کا باعث ہوگا۔

میر احسان علی مرثیہ گو نے جو سعادت علی خاں کے دور میں گزرا ہے محرم کی عزاداری ۲۰ صفر تک بڑھا دی۔ اس سے پہلے عزاداری ۱۰ محرم تک ہوتی تھی۔ اس طرح گویا تعزئے ۲۰ صفر سے پہلے دفن نہ ہوتے تھے۔

بادشاہ بیگم نے نصیر الدین کے سن جلوس کے پہلے سال، اعلان کیا کہ چہلم تک عزاداری تسلیم کی جائے گی اور شادی کے جلوس اس مدت تک شہر میں نکل نہیں سکتے اور جو شخص خلاف ورزی کرے گا اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ چونکہ یہ اعلان عام مفاد کے خلاف تھا اس لئے رزیڈنٹ نے بادشاہ سے گفتگو کی اور بڑی مشکل سے شاہی فرمان کو منسوخ کرایا۔ بادشاہ نے اس کے بعد دوسرا فرمان شایع کیا کہ مذہبی حیثیت سے رعایا کو عام اجازت ہے جو چاہیں وہ اپنے عقاید کی رو سے کریں لیکن بادشاہ بذات خود چہلم تک عزاداری کریں گے۔

اس فضا میں تعلیم پانے کے نتائج یہ ہوئے کہ نصیر الدین حیدر نے اپنی حکومت کا تمام زمانہ انھیں رسوم کی پابندی میں صرف کر دیا اور سلطنت کی سیاسی و معاشی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمال سرکاری نے خود شاہی آمدنیوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا اور بدنظمی ہر جگہ نظر آنے لگی۔

دوسرا باب

جب یمین السلطنت نواب سعادت علی خاں نے ۲۲ رجب ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۱ جولائی ۱۸۱۴ء کو انتقال کیا تو شب کے تین حصے گزرنے کے بعد نواب غازی الدین حیدر نے کمپنی کے نمایندوں کی امداد سے تخت سلطنت پر قدم رنجہ فرمایا اور بادشاہ بیگم کو حسب ذیل خطاب عطا ہوا: "مریم العصمت بلقیس السطوت محل خاص نواب وزیر الممالک رفعت الدولہ رفیع الملک غازی الدین حیدر خاں بہادر شہامت جنگ"۔ ولی عہد کو بھی "امتیاز الدولہ عمدۃ الملک نصیر الدین حیدر خاں بہادر اسد جنگ" کا خطاب ملا۔ آغا میر[1] کو نیابت کے عہدہ کے ساتھ "معتمد الدولہ مختار الملک سید محمد خاں بہادر ضیغم جنگ" خطاب عطا ہوا۔ بادشاہ بیگم کو خطاب کے ساتھ سلون کا پرگنہ بھی جاگیر میں ملا۔

محل میں شاہجہاں آباد کی ایک سیدزادی کا طوطی بول رہا تھا اور ڈیوڑھی باہر بادشاہ بیگم کی جاگیر کا اہتمام و انصرام میر فضل علی کے سپرد تھا اور ایوان شاہی اور سلطنت کا سیاسی نظم و نسق معتمد الدولہ کے سپرد تھا۔

---

[1] بشپ ہیبر نے آغا میر کو لکھنؤ میں ۱۸۲۶ء میں دیکھا تھا اس نے لکھا ہے کہ: "وہ سیاہ فام ہے، سخت مزاج ہے، اس کی ناک باز کی طرح ہے اور اس کے چہرہ سے یہ عیاں ہے کہ وہ حکومت کا ست یدائی ہے۔ سختی کے ساتھ اس میں رکھاپن بھی پایا جاتا ہے۔ ..... وہ پہلے موجودہ بادشاہ کا خانساماں تھا"۔ لکھنؤ میں ان کی ڈیوڑھی مشہور ہے جس میں اب گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج قایم ہے۔ درمیان میں سڑک آجانے کی وجہ سے ڈیوڑھی کا شاگرد پیشہ علٰحدہ ہوگیا ہے۔

نواب ناظر محمد عفرین[1] علی خاں اور مرزا قمرالدین احمد معروف بہ مرزا حاجی (خلف مرزا جعفر مرحوم[2]) ۱۸۱۵ء/۱۲۳۰ھ میں بادشاہ کے مزاج میں زیادہ دخیل ہو گئے تھے یہ نواب صاحب کے کان معتمدالدولہ کے خلاف بھرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں پناہ معتمدالدولہ سے ناراض ہو گئے۔ جس وقت لکھنؤ میں یہ واقعات درپیش تھے اُسی زمانہ میں لارڈ مویرا مارکوئس آف ہسٹنگس گورنر جنرل فرخ آباد تشریف لائے ہوئے تھے نواب غازی الدین حیدر نے یہ طے کیا کہ ولی عہد معتمدالدولہ اور راجہ دیاکشن[3] کی معیت میں جاکر نواب گورنر جنرل بہادر سے ملیں اور چند اہم معاملات میں گفت و شنید بھی کریں، اس موقعہ سے بھی لوگوں نے فایدہ اُٹھایا اور معتمدالدولہ کی غیبت میں کافی کان بھرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ فرخ آباد سے واپسی پر معتمدالدولہ کا دربار میں آنا بند ہو گیا اور ریاست کے معاملات نواب ناظر اور اُن کے گماشتہ خدا بخش اور مرزا حاجی کے سپرد کئے گئے۔

۱۸۱۷ء/۱۲۳۲ھ میں ان کو دوبارہ بادشاہ کا تقرب حاصل ہو گیا اور معتمدالدولہ نے اس مرتبہ دربار کو اپنے دشمنوں سے صاف کر دیا۔ اس سال نواب گورنر جنرل بہادر کی ایما پر بہاری لال مہاجن کے انتظام سے بیش قیمت تاج بنوایا گیا۔ اور اس تقریب میں جان مکانٹش کے ذریعہ سے فرخ آباد، کانپور، الہ آباد، جونپور کے تمام انگریزی حکام کو بھی مدعو کیا گیا اور ۱۹ اکتوبر ۱۸۱۸ء مطابق ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۳۳ھ کو انگریز حکام کی موجودگی میں اودھ کی شہنشاہی کا اعلان کر دیا گیا اور معزز افراد کی نذر قبول کی گئی اور خطبہ و سکہ جاری ہوا۔ مہر شاہی پر حسب ذیل عبارت کندہ تھی: "ابوالمظفر معزالدین غازی الدین شاہ زمن"۔ اور سونے چاندی کے سکوں پر یہ عبارت کندہ تھی:

سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

معتمدالدولہ کو وزارت اور ولی عہد بہادر کو سلیمان جاہ کا خطاب ملا۔

بادشاہ بیگم اپنے اقتدار کی بہت خواہش مند تھیں انھوں نے یہ سوچ کر کہ نیابت ولی عہد کا حصہ خاص ہے اس سے انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میر فضل علی کو نیابت کی امداد کے لئے مقرر کیا جائے۔ لیکن وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہوئیں، معتمدالدولہ نے اس معاملہ کو بھانپ لیا اور کوشش کی کہ بادشاہ محل میں جانا موقوف کر دیں۔ جب تعلقات زیادہ کشیدہ ہو گئے تو کچھ عرصہ کے بعد محسن الدولہ بہادر نے اپنی نانی کی رفاقت سے منہ موڑا اور بادشاہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو گئے لیکن سلیمان جاہ نے بیگم کا ساتھ نہ چھوڑا۔ معتمدالدولہ نے ہر ممکن طریقہ سے میر فضل علی کو گرفتار کرنا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

بادشاہ بیگم نے میر فضل علی کی مدد سے سپاہیوں کی کثیر تعداد قصبات اور جاگیرات سے طلب کی تاکہ وقت ضرورت اُن سے کام لیا جائے

---

[1] محمد عفرین علی خاں آصف الدولہ کا غلام تھا جو درجہ بدرجہ ترقی کرتا گیا۔ اُس کا دربار اودھ میں بڑا رسوخ اور اثر تھا ۱۸۱۷ء میں اُس کا انتقال ہوا۔

[2] کرنل بیلی ریزیڈنٹ پر مرزا جعفر کا بڑا اثر تھا اور اس نے غازی الدین حیدر کے حق میں کمپنی بہادر کا فیصلہ صادر کرایا۔ اُن کی خیر خواہی کا کوئی صلہ نہ دیا گیا ۱۸۱۴ء میں وہ خاموش ہو کر عالم جاودانی کو سدھارے۔ اُن کے صاحبزادے مرزا حاجی جنھوں نے کسی اعلیٰ عہدہ کو کبھی قبول نہ کیا تھا وہ مرزا جعفر کے مقابلہ میں زیادہ خوش نصیب ثابت ہوئے باپ کے مرنے کے بعد کچھ عرصہ تک وزارت کے فرائض انجام دئے۔

[3] راجہ دیاکشن کو غازی الدین حیدر نے دیوانی کے عہدہ تک پہونچایا اور راجہ کا خطاب عطا کیا۔ راجہ جھاؤلال کے دور حکومت میں واصل باقی نویس تھے۔ تفضل حسین خاں کے عہد میں معزول کئے گئے لیکن آصف الدولہ نے دوبارہ مقرر کیا۔

معتمد الدولہ نے بادشاہ سے کہا کہ بادشاہ بیگم میر فضل علی کو سرکاری عمال کے حوالہ کرنے پر حیار نہیں ہیں اس لئے اگر وہ اب شاہی احکام کی پابندی نہ کریں گی تو میر فضل علی کو بہ زور قوت حاصل کیا جائے گا۔ چنانچہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۲ اگست ۱۸۳۲ء شاہی فوج نے بادشاہ بیگم کے محل سرا کا محاصرہ کر لیا۔ بادشاہ بیگم نے بھی اپنی فوج کے ایک رسالہ کو شاہی فوج سے لڑنے کا حکم دیدیا اور میر فضل علی کو حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جب نوبت یہاں تک پہونچی تو معتمد الدولہ نے اس مسئلہ کو رزیڈنٹ سے رجوع کیا انھوں نے تلنگوں کے دو رسالے سید باقر علی خاں میر منشی کی معیت میں محل شاہی پر بھیجے اور حکم دیا کہ یہ لوگ خود جاکر بیگم صاحبہ سے درخواست کریں کہ میر فضل علی کو سرکاری عمال کے حوالہ کر دیا جائے اور اگر اسوقت بھی بیگم اپنی ضد پر قایم رہیں تو فوجی طاقت کا استعمال کیا جائے میر منشی اور کپتان ہامس نے یہ گھنٹہ اس جدوجہد میں صرف کئے بالآخر سلیمان جاہ کے ذریعہ سے بیگم نے میر فضل علی اور فیض النساء کو کمپنی کے سپرد کر دیا۔

میر فضل علی کی لاکھوں روپیہ کی املاک شاہی عمال کے ہاتھوں برباد و تاراج ہوئیں، خصوصیت سے معتمد الدولہ کے ملازموں نے خوبصورت عمارتوں اور مضبوط حویلیوں کو زمین کے برابر کر دیا۔ لیکن بادشاہ بیگم کو اس قسم کے مصائب و تکالیف سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ شاہی محل کی ڈیوڑھی پر سرکار انگریزی کی فوج کا پہرہ تھا، ہر آیندہ و روندہ کی تحقیقات کی جاتی تھی۔ یہ پابندی گو بظاہر محل میں رہنے والوں کو قید خانے سے بہتر نظر آتی تھی ..... لیکن بادشاہ بیگم اور سلیمان جاہ کی املاک اور ذاتی اعزاز اور احترام میں کوئی فرق نہ آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میر فضل علی اور فیض النساء ۲ اکتوبر ۱۸۳۲ء مطابق ۱۹ محرم ۱۲۴۸ھ کو اپنی خواہش پر انگریزی رسالہ کی محافظت میں شاہجہاں آباد چلے گئے بادشاہ نے حسب ذیل ۳ فرامین شایع کئے جنکی رو سے بادشاہ بیگم، سلیمان جاہ اور میر فضل علی کو جرم و بغاوت کا ملزم قرار دیا گیا۔

(۱) پیشہ ور سپاہیوں اور مسلح اشخاص کے نام

سمع اقدس میں یہ آیا ہے کہ اکثر پیشہ ور سپاہی اور مسلح لوگ علی الاعلان یا خفیہ طور سے میرے بیٹے سلیمان جاہ کی سلک ملازمت میں داخل ہو گئے ہیں، اگر ایسا کوئی واقعہ سمع اقدس میں آیا تو ملزمین کو سخت عبرتناک سزائیں دیجائیں گی اُن کی املاک ضبط ہو جائے گی اور حبس دوام کی سزا بھی ملے گی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عوام اپنے مال و منال اور اہل و عیال کے تحفظ کے خیال سے سلیمان جاہ کی ملازمت نہ کریں۔

(مطبوعہ چھاپہ خانہ سلطانی (شاہی مطبع) مورخہ ۱۲ محرم ۱۲۳۸ھ)

(۲) شاہی فوج کے افسروں کے نام

ہرگاہ کہ نصیر الدین حیدر نے میر فضل علی کی ترغیب سے جہاں پناہ کے احکام کی خلاف ورزی کی اُس کی پاداش میں پہلے وہ مجلس میں رکھا گیا بعدہ اُس کو مع اہل و عیال کے شہر چھوڑنے کی اجازت عطا کی گئی۔ اس لئے مناسب سمجھا جاتا ہے کہ یہ عام اعلان کیا جائے کہ ہماری فوج کے افسروں کو نصیر الدین حیدر سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہئے، اس فرمان کے عدول حکمی کی پاداش میں قید سخت برطرفی انضباط املاک کی سخت از سخت عقوبتیں دی جائیں گی۔

(مطبوعہ سلطانی (چھاپہ خانہ) لکھنؤ
مورخہ ۱۲ محرم ۱۲۳۸ھ)

(۳) ہرگاہ یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ میر فضل علی نے ڈیوڑھی پر اپنی خالہ فیض النسا (مغلانی خاص محل) کی وساطت سے ملازمت حاصل کی۔ اور درجہ بہ درجہ ترقی کرکے داروغہ کے عہدہ تک پہونچا چونکہ وہ نسبتاً اچھا تھا اس لئے یہ خفیف ترقی بھی اُس کو باغی اور غدار کرنے کے لئے کافی تھی۔ اُس نے شاہی محلات جاگیرات اور سلطانی ڈیوڑھی سے لاکھوں روپیہ خورد برد کیا، یہی نہیں بلکہ میر فضل علی نے سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ بلکہ سلطنت میں انقلاب پیدا کرنے اور فتنہ و فساد کے لئے ایک خطرناک سازش میں حصہ لیا اور اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے اُس نے میرے لڑکے سلیمان جاہ کو شاہی احکام کے پس پشت ڈالنے کی ترغیب دی اُس نے سلیمان جاہ کو مستقبل کے متعلق غلط توقعات دلائے اور سرکش بنایا۔ شاہی خاندان میں فتنہ و فساد کا بیج بویا۔ غلط فہمیاں پیدا کیں بلکہ شہزادہ کو آمادہ کرلیا کہ وہ محل شاہی کے جملہ ملازمین و رہنے والوں کے ساتھ دارالخلافت سے باہر جاکر سکونت اختیار کریں ایک بڑا اثر اس غلط تربیت کا یہ ہوا کہ شہزادہ عمدہ تعلیمات اور حقیقی تربیت سے محروم رہا۔ سلیمان جاہ نے نوعمری اور ناتجربہ کاری کے دور میں برے نتائج و عواقب پر غور نہ کیا بلکہ اس بدنفس کی رائے پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ میر فضل نے ایک قدم اور بھی آگے اُٹھایا کہ دارالخلافت میں ایک علٰحدہ فوج تیار کرلی اس لئے وہ شاہی خوشنودی سے محروم کیا گیا اُس کی پاداش میں اُس کو مجلس شاہی میں رہنا پڑا۔ آیندہ چل کر اُس کے اہل و عیال دارالسلطنت سے شہر بدر کردئے گئے اس لئے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جو شخص بغاوت، سازش اور غداری کی پاداش میں ماخوذ ہوگا وہ بدترین عقوبتوں کا مستوجب ہوگا۔

(مطبوعہ چھاپہ خانہ سلطانی لکھنؤ مورخہ ۱۲ محرم سنہ ۱۲۳۸ھ)

اس وقت بادشاہ بیگم کے محل کا محاصرہ تھا انھوں نے معمولی کھانے پر گزارہ کیا وہ یا تو خود کھانا پکاتی تھیں یا اُنکی نواسیاں معمولی دال روٹی تیار کیا کرتی تھیں۔ پانی بھی میسر نہ آتا تھا۔ بادشاہ بیگم یا اُن کی نواسیاں (حاجی بیگم یا وزیر بیگم) خود بہ نفس نفیس کنویں سے پانی بھرتی تھیں۔ بادشاہ بیگم کے جانوروں کو بھی ۷، ۸ دن کے بعد غذا مل سکی۔ شاہی مرضی نہ پاکر بہت سے ملازمین نے بادشاہ بیگم کی ملازمت ترک کردی۔ چند وفادار ملازمین نے عرصہ کے بعد بھٹکتے ہوئے چینوں سے فاقہ کشی دور کی۔ یہ حالات دربار اودھ میں اُسوقت تک جاری رہے جب تک مارڈنٹ ریکٹس رزیڈنٹ مقرر ہوکر آئے انھوں نے ان مظلومین کی جانب سے جہاں پناہ سے سفارش کی اور ان لوگوں کے قصور معاف ہوئے۔

۹ ذی الحجہ کو جب شب کا ایک حصہ گزر چکا تھا تو امام بخش مرصا (خلف فتح علی) کو حکم دیا گیا کہ وہ ولی عہد بہادر کے پاس خفیہ طور پر ایک پیام لے جائے۔ جب شاہی قاصد نے اطلاع بھیجی تو صاحب بہ نفس نفیس محل سے باہر تشریف لائے اور مطلع کیا کہ وہ بذات خود جہاں پناہ کی خدمت اقدس میں جانے اور ہر حکم کو بجا لانے کے لئے طیار ہیں۔ ان خدمات جلیلہ کے صلہ میں فتح علی کے لڑکے کو خلعت چہار پارچہ عطا ہوا اور امام بخش کو دوشالہ اور رومال ملا۔ دوسرے دن جلوس و سواری کے لئے شاہی احکام نافذ ہوئے اور بیٹیاں اور صاحبزادے خاص برداروں کو تقسیم کئے گئے۔ اُسی ماہ کی دسویں تاریخ کو فتح علی خاں[1] اور امرت لال[2] صاحب عالم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر کورنش بجالائے اور عرض کیا کہ جہاں پناہ نے حضور کو یاد کیا ہے۔ صاحب عالم فوراً طیار ہوگئے اور خدمت شاہی میں

---

[1] فتح علی خاں۔ نواب سعادت علی خاں کے ملازمین میں بہت منتخب تھے محض اپنی دیانت کی بنا پر ذی عزت عہدہ پر پہونچے اور شاہی خزانہ کے مہتمم مقرر ہوئے۔ سعادت علی خاں کے جانشینوں کے زمانہ میں بھی یہ اسی عہدہ پر قایم رہے۔ ہر شخص اُن کی عزت کرتا تھا۔ [2] امرت لال کایتھ سکسینہ تھے وہ سعادت علی خاں کے عہد ہمایوں میں سلک ملازمت میں داخل ہوئے اور غازی الدین حیدر کی شہنشاہی میں دیوانی کے درجہ پر پہونچے

حاضر ہو کر قدمبوسی کا شرف حاصل کیا، جہاں پناہ نے نہایت شفقت سے معانقہ کیا اور کچھ نصیحتیں بھی کیں اُسوقت حسن اتفاق سے رزیڈنٹ بھی تشریف لائے اور اُنھوں نے بھی شاہی ایما پر صاحب عالم سے معانقہ کیا، جب جہاں پناہ تخت شاہی پر رونق افروز ہوئے تو صاحب عالم نے نذر پیش کی اور خلعت حاصل کیا تو دوبارہ نذر پیش کی اور نہایت درجہ خوش وخرم شادماں وفرحاں دربار سے واپس ہوئے اور دربار شاہی سے محل تک ۳ ہزار روپیہ غربا و مساکین کو تقسیم کیا۔

جہاں پناہ نے گیارھویں تاریخ کو رزیڈنٹ سے استدعا کی کہ صاحب عالم کے محل سے فوجی پہرہ کا دستہ ہٹا لیا جائے۔ رزیڈنٹ نے جواب دیا کہ کمانڈنگ افسر منڈیاؤں[1] کو مطلع کر دیا گیا ہے وہ عمل درآمد حسب مرضی جہاں پناہ کریں گے۔ جب رسالہ واپس لے لیا گیا تو جہاں پناہ نے ۳ ہزار روپیہ بطور انعام کے انگریزی رسالہ میں تقسیم کے لئے عطا کیا۔

بادشاہ بیگم نے اب بھی ہر امکانی کوشش کی کہ صاحب عالم دربار نہ جائیں اور نہ شکار کے لئے محل سے باہر نکلیں بلکہ محل میں خواصوں اور ڈومنیوں میں مشغول رکھنے کی کوشش کی۔ بالآخر صاحب عالم خود اس پابندی سے عاجز آ گئے اور ایک دن جہاں پناہ سے دوران گفتگو میں بادشاہ بیگم سے اپنی ناراضگی کا تذکرہ بھی کیا، یہ سنتے ہی جہاں پناہ نے ششیش محل، حیدر باغ اور حسن باغ کے محلات کو آراستہ کرنے کا حکم دیا اور تنہائی کے خیال سے نواب معتمد الدولہ کو حکم دیا کہ وہ صاحب عالم کی دلچسپی کے اسباب مہیا کریں اور خود بھی اکثر اوقات اُن کی صحبت میں رہیں، معتمد الدولہ جن کو اپنے اقتدار کے بڑھانے کی فکر شبانہ روز تھی وہ جہاں پناہ کے پاس حاضر ہوئے اور دست بستہ عرض کیا کہ جب تک اعتماد باغ اور دوسرے محلات صاف ہوں خانہ زاد کی بارہ دری دولت پورہ میں حاضر ہے وہ خوش وضع ہے صاحب عالم اُس بارہ دری میں نزول اجلال فرمائیں۔ جہاں پناہ نے بھی اس تجویز کو پسند فرمایا اور امرت لال عرض بیگی صاحب عالم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاہی حکم پیش کیا۔ چنانچہ صاحب عالم محسن الدولہ اور روشن الدولہ کی معیت میں فوراً دولت پورہ کی بارہ دری میں تشریف لے گئے۔ جسوقت سواری مبارک شہر سے گزری ہزارہا مخلوق زیارت کی مشتاق دورویہ جمع ہو گئی اور اپنے محبوب شہزادہ کو سلامی دی۔ صاحب عالم کے اصطبل کے گھوڑے فاقوں سے بھوکے مر رہے تھے اور چند قدم بھی اُن سے چلنا مشکل تھا۔

جب مرشد زادہ آفاق صاحب عالم کی سواری مبارک بارہ دری کے قریب پہونچی تو نواب معتمد الدولہ خود بنفس نفیس استقبال کے لئے پاپیادہ باہر سڑک پر موجود تھے۔ جیسے سواری آئی سلامی دی گئی اور جب صاحب عالم بارہ دری میں مسند آبائی پر متمکن ہوئے تو نواب معتمد الدولہ نے نذر پیش کی۔

بیسویں تاریخ تک صاحب عالم شاہی احکام کی رو سے اس بارہ دری میں مقیم رہنے کے بعد نواب معتمد الدولہ کی معیت میں حسن باغ تشریف لے گئے اور وہیں قیام کیا۔ روشن الدولہ اور معتمد الدولہ بادشاہ بیگم کی محل سرا پر حاضر ہوئے اور صاحب عالم کی محل خاص سلطانی بیگم کو معہ مرزا رفیع الدین حیدر معروف بہ منا جان کے حسن باغ پہونچا دیا۔ محل خاص کی سواری مبارک بھی

---

[1] منڈیاؤں، لکھنؤ سے ۴ میل شمال کی طرف واقع ہے یہ نام اُس قدیم چھاؤنی کی وجہ سے ہے جو غدر سے پہلے یہاں تھی جس کو نواب سعادت علی خاں نے بنوایا تھا۔ منڈیاؤں کی فوج نے ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی اور چھاؤنی میں آگ لگا دی۔ دوبارہ آباد نہیں کی گئی۔ اب بھی چھاؤنی کے آثار نظر آتے ہیں۔

باجے گاجے کے ساتھ فتح علی عرض بیگی کے جلو میں حسن باغ پہونچی اور روشن الدولہ[1] دربار شاہی میں حاضر ہوئے۔

سلیمان جاہ کی فرقت بادشاہ بیگم کو اس درجہ محسوس ہوئی کہ انھوں نے کھانا پینا ترک کر دیا۔ ساتویں صفر کو معتمد الدولہ محل سرائے شاہی میں حاضر ہوئے اور استدعا کی کہ خانہ زاد جو نان جویں بھیجے وہ قبول فرمالیں اور ازراہ کرم خسروانہ اُس طعام کو تناول فرمالیا کریں، بادشاہ بیگم نے قبول کیا اور ۱۲ تاریخ تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن بیگم کی مرضی پر بند کر دیا گیا اور بادشاہ نے ۲ لاکھ کی رقم بادشاہ بیگم کو عطا کی بادشاہ بیگم نے ایک خواص کو سلیمان جاہ کی خدمت میں کپڑے اور ۷ ہزار روپیہ نقد دیکر بھیجا اور وعدہ کیا کہ وہ اسی قدر رقم ماہ بہ ماہ اُن کو بھیجتی رہیں گی۔ صاحب عالم نے کپڑے لے لئے اور روپیہ واپس کر دیا۔

چونکہ خواصوں کے ذریعہ سے بادشاہ بیگم اور صاحب عالم میں رسل ورسایل کا طریقہ جاری تھا اس لئے جلد ہی خوشامدیوں نے صاحب عالم کو ترغیب دی کہ وہ بادشاہ بیگم سے صفائی کرلیں، صاحب عالم نے ۲۷ صفر کو مطلق کھانا نہ کھایا اور ۲۷ صفر کو بیگم کی خدمت میں واپس چلے گئے۔

(باقی)

مشیر احمد علوی

---

[1] روشن الدولہ ۔ ۱۸۳۲ء میں وزارت پائی۔ مسٹر شور نے اپنی کتاب "ہندوستان واقعات پر نقوش" میں لکھا ہے کہ "وہ بہت عمدہ خصلت کے انسان تھے۔ لیکن عقل کی کمی تھی"۔ ایک دوسرے رزیڈنٹ نے ۱۸۳۲ء میں لکھا ہے کہ "روشن الدولہ۔ عمدہ خصلت کا انسان ہے۔ مستقل مزاجی نہیں ہے"۔ مشہور مورخ ٹل نے بھی اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا کہ "وہ معزز آدمی تھا لیکن فراست کی کمی تھی اور کام سے ناواقف تھا۔ اُن کی حویلی میں آجکل ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کا دفتر ہے۔

"نگار" کے پچھلے پرچے

۱۹۲۶ء: جنوری ۸ر۔ ۱۹۲۷ء: اگست عہ ر۔ ۱۹۲۸ء: مئی عہ ر جون عہ ر ۱۹۳۰ء: مئی ۱۲ر۔ ۱۹۳۱ء: جولائی تا دسمبر ۸ر فی پرچہ۔ ۱۹۳۲ء جنوری ۱۲ر فروری، مارچ، مئی، جون، جولائی، ستمبر، نومبر ۸ر فی پرچہ۔ دسمبر عہ ر۔ ۱۹۳۳ء: فروری ۸ر۔ ۱۹۳۴ء: فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر فی پرچہ۔ ۱۹۳۶ء: دسمبر ۱۲ر۔ ۱۹۳۷ء: فروری، مارچ ۱۲ر فی پرچہ اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ر فی پرچہ، ستمبر، اکتوبر، دسمبر ۱۲ر فی پرچہ۔ ۱۹۳۸ء: فروری، اپریل، تا دسمبر ۴ر فی پرچہ، ۱۹۳۹ء: فروری تا جولائی ۴ر فی پرچہ۔ اکتوبر و نومبر ۸ر فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

طلسم عمل

اُردو زبان میں پہلی کتاب جس میں "نفسیات" کے اس راز کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ ایک انسان کیونکر کامیاب زندگی بسر کرسکتا ہے۔ یہ ترجمہ ہے مسٹر ڈیل کارنیگی کی اس مشہور کتاب کا جو شایع ہوتے ہی لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوگئی۔ ترجمہ اس قدر سلیس و سادہ ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ سے نفسیاتی حقایق کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک افسانہ کی دلچسپی اس میں پیدا ہوگئی ہے۔ کتاب کو ایکبار شروع کرنا اسے ختم کر دینا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۸ر

منیجر نگار لکھنؤ

لکھنؤ کی زبان

اُصول اور روایت کی روشنی میں

ٹکسالی زبان کا مسئلہ ملک میں مدت سے پریشاں خیالی کا شکار بنا ہوا ہے ایک گروہ دہلی کی زبان کو ٹکسالی سمجھتا ہے تو دوسرا لکھنؤ کی زبان کو۔ کوئی ان دونوں میں سے کسی کی مرکزیت کا قائل نہیں بلکہ ہر جگہ کی زبان کو ٹکسالی سمجھتا ہے، انھیں لوگوں میں ہمارے مکرم یاس عظیم آبادی بھی ہیں۔ موصوف نے ایک کتاب چراغ سخن کے نام سے تحریر فرمائی ہے جس کی ابتدا میں اسی گروہ کی ترجمانی میں ایک طولانی بحث اس موضوع پر کی ہے جس کا حاصل انھیں کی لفظوں میں یہ ہے:

"لکھنؤ والے جاہل، نافہم، احمق، متعصب، تنگ نظر اور بے خبر ہیں کیونکہ وہ صرف لکھنؤ ہی کو زبان کا مرکز سمجھتے ہیں انھیں یہ بھی خبر نہیں کہ اُردو کہاں سے کہاں تک پھیل گئی۔ جن جن شہروں میں اُردو بولی جاتی ہے وہ سب شہر زبان کے مرکز اور وہاں کے باشندے اہلِ زبان ہیں۔"

چونکہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر قومی زبان کی یکسانیت اور حُسن و قبح کا انحصار ہے اس لئے جی چاہتا ہے کہ اس پر اُصول، روایت، تاریخ اور درایت کی روشنی میں ایک فیصلہ کن بحث کی جائے۔

زبان کے لئے مرکز کی ضرورت

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر زبان کے لئے ایک مرکز ہونا ضروری ہے جہاں کی زبان مستند اور ٹکسالی ہو ورنہ نہ کسی زبان کے قواعد صرف و نحو منضبط ہو سکتے ہیں اور نہ اُس کا صحیح استعمال ممکن ہے۔ جب ہم ہر شہر کو زبان کا مرکز اور ہر شخص کو اہلِ زبان مان لیں گے تو پھر اس صورت میں جزوی اختلافات اتنے بڑھ جائیں گے کہ صرف و نحو کے قواعد کا انضباط محال ہو جائے گا۔ اس کی جیتی جاگتی مثال لکھنؤ اور دہلی کا اختلاف ہے چونکہ یہ اختلاف ابھی دو ہی شہروں تک محدود ہے اس لئے ہم اس کا استقرار کر سکتے ہیں لیکن جب حد سے بڑھکے ہر شہر میں یہ بات پھیل جائے گی تو اُس وقت اُس کا استقرار محال ہو جائے گا اور زبان کا حاصل کرنا ایک اجنبی کے لئے ناممکن ہو جائے گا۔ دیہاتی زبان کی مثال سامنے موجود ہے کہ ایک صوبہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اچھا خاصہ تغیر نظر آتا ہے اگرچہ یہ زبانیں ادبی نہیں ہیں اور ان کا ذخیرۂ الفاظ اتنا محدود ہے کہ اس پر اطلاع حاصل کرنا چنداں دشوار نہیں پھر بھی جب ایک ضلع کا باشندہ دوسرے ضلع میں پہونچتا ہے، تو بہت سے الفاظ اُس کی سمجھ میں نہیں آتے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ دیہاتیوں کی زبان کا کوئی مرکز نہیں اور اگر آج کوئی صرف یو۔پی کی دیہاتی بولیوں کا استقراء کرنا چاہے تو ممکن نہیں۔ دیہاتیوں کا کام تو صرف اس وجہ سے چل جاتا ہے کہ اُن کی روزمرہ کی ضرورتیں اُس محدود رقبہ میں اُس بولی سے پوری ہو جاتی ہیں اس سے زیادہ کی اُن کو ضرورت نہیں لیکن ایک ادبی زبان جو پورے ملک یا ایک پھیلی ہوئی قوم

کی زبان ہو اس اختلاف کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی اسی لئے جو شہر زبان کا مرکز ہوتا ہے اُس کے بھی تمام باشندے اہلِ زبان نہیں سمجھے جاتے بلکہ خاص خاص گھرانوں کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے۔ انشاء اللہ خاں کہتے ہیں:

"سند اردو از گفتگوئے ملوک و امراء و حواشی و حضار شان جستن بہتر است کہ فقیہ و شاعر مہندس و محاسب و مغنی و صوفی و زنان پری چہرہ در مجلس شان حاضر می باشند و اصطلاح ہر فرقہ در گوش دارند و در ہر لفظیکہ اصلاح جاری کنند بزرگ و کوچک را در قبول کردن آں گزیر نہ باشد و زود تر مروج می شود و ہر شخص فصیح و بلیغ در مجلس شان لنگ می گردد و اگر سخنے را درست می گوید و پسند خاطر امیر و حضار می شود بہ مباہات نزد اماثل و اقران ذکر آں بزبان می آرد و صاحب کمال را در وقت حرف زدن در خاطر خلد کہ مبادا حرفے از زبان من برآید کہ موجب ریشخند شود و ہمچنیں بندش دستار و دوخت قبا و زیر جامہ و کفش ہر چہ رواج می باید بر پسند اینہا موقوف است"[1]

اگر زبان کا دائرہ اتنا تنگ نہ کیا جائے اور اُس کا یہ اُصول نہ معین کیا جائے تو پھر شہری و دیہاتی زنانی و مردانی خواص و عوام کی زبان میں کوئی وجہ امتیاز باقی نہیں رہ سکتی، ہر شہر کی زبان الگ ہو جائے اور اُس کی صرف و نحو اُس کے جغرافیے کی طرح ایک علٰحدہ چیز ہو جائے اور نہ وہ ادبی و علمی زبان بن سکتی ہے۔

الفاظ کی صحت کا معیار

کسی زبان کے الفاظ خدا کی طرف سے تو نازل ہوئے نہیں ہیں جس سے ان کا صحیح تلفظ معلوم ہو جائے اس لئے کسی لفظ کی صحت کا معیار بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم کچھ لوگوں کے تلفظ کو معیاری مان لیں اور جو لفظ جس طرح اُن کی زبان سے نکلے وہی اُس کا صحیح تلفظ سمجھیں اگر اس اصول کو ہم نہیں تسلیم کرتے تو دنیا میں کسی لفظ کے صحیح و غلط ہونے کا کوئی مفہوم ہی نہ رہے گا۔ دورِ آخر کے محقق زبان شیخ ممتاز حسین عثمانی اڈیٹر اودھ پنچ لکھتے ہیں:

"زندہ زبانوں میں سے کوئی ایسی نہیں جس کا مرجع کوئی خاص قطعۂ زمین نہ ہو فارسی میں شیراز و طہران کی زبان مستند ہے، انگریزی زبان لندن کی مستند ہے امریکہ میں بھی انگریزی مروج ہے لیکن امریکہ زبان کے اعتبار سے لندن کی خوشچینی کرتا رہتا ہے۔ سیاسی خیالات میں خلاف و عناد ہے مگر ادبی خیالات میں شمہ بھر نا اتفاقی نہیں ہے علیٰ ہذا القیاس آسٹریلیا اور افریقہ (جہاں کئی پشتوں سے انگریز آباد ہیں اور وہ اپنی فوج کو ایک علٰحدہ فوج تصور کرتے ہیں) لندن کو معیار و مرکز زبان تسلیم کرتا ہے"[2]

لہٰذا اُردو کا بھی ایک مرکز ماننا ضروری ہے یہاں یہ بات ضرور غور طلب ہے کہ کس جگہ کو مرکز مانا جائے اس کے لئے ایسا اُصول ڈھونڈھنا چاہئے جسکی بنا پر کسی ایک شہر کو مرکزیت کا فخر حاصل ہو سکے اس کے لئے چند لمحے سکون کے مجھے عاریت دیجئے ممکن ہے کسی اُصول کی روشنی میں کوئی اونچی جگہ نظر آجائے۔

لفظ کی تعریف

یہ بتایا جا چکا ہے کہ لفظوں کا سانچا اہلِ زبان کا منہ ہے جو لفظ جس طرح اُن کی زبان سے نکلے وہی اُس کا اصلی تلفظ ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ لفظ کیا چیز ہے؟ لفظ حرفوں سے مرکب ہوتا ہے۔ انسان کے منہ سے جو آوازیں نکلتی ہیں اُن کی کچھ علامتیں مقرر کی گئی ہیں انھیں علامتوں کو حروف کہتے ہیں ہر حرف سے ابتداءً جو آواز نکلتی ہے وہی

---

[1] دریائے لطافت ص۳۰۰ - [2] اودھ پنچ ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۲۵ء

اُس کی اصلی آواز ہے یہ آوازیں انسان کے لب و دہن اور زبان کی جنبش سے پیدا ہوتی ہیں اور ذرا ذرا سے فرق سے ایک نئی آواز پیدا ہو جاتی ہے۔

حروف کی تشکیل میں آب و ہوا کا اثر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عرب ہمیشہ "ٹوٹو" کو "تتو"، "لڈو" کو "لدو" کہتا ہے ایک یورپ کا باشندہ "گھوڑے" کو "گھورا" یہی حالت ایک ایرانی کی ہوتی ہے کہ ٹ، ڈ، ڑ، کی آواز صاف نہیں نکال سکتا اس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جس طرح مختلف ممالک کے باشندے آب و ہوا کے اثر سے مختلف صورت و شکل اور مختلف عادات و اطوار رکھتے ہیں اُسی طرح اُن کے کلّے، جبڑوں، حلق، تالو، زبان اور لب کی لچک یا لوچ میں بھی فرق ہوتا ہے۔ جب ایک ملک کے رہنے والے اپنے اصلی حرف بولتے ہیں تو ہر حرف کی ٹھیک ٹھیک آواز بے تکلف نکالتے ہیں اور وہی آواز اُس حرف کی معیاری ہوتی ہے اور جب دوسرے ممالک کے لوگ وہ حرف بولتے ہیں تو صاف نہیں ادا کر سکتے اس لئے وہ آواز معیار سے گر جاتی ہے۔

سیاسی اثر زبان پر اُصول سیاست کا بھی اقتضا یہی ہے کہ تمام صوبوں کی زبانیں ایک رشتۂ اتحاد سے جوڑ دی جائیں اور اسی لئے دارالسلطنت کی زبان معیاری قرار پاتی ہے اور ہر صوبہ میں حکومت اُس کی ترویج کی کوشش کرتی ہے خود ہر صوبے کے باشندے بھی دفتری ضرورت، شاہی قربت، حصول ملازمت کی خواہش سے مجبوراً دارالسلطنت کی زبان کو معیاری سمجھتے ہیں اور اُس کو شوق حاصل کرتے ہیں نیز اُس سانچے میں اپنی زبان کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انشاء اللہ خاں کہتے ہیں:

"در ہر مملکت قاعدہ این است کہ صاحب کمالاں و خوش بیاناں آنجا در شہرے کہ قرارگاہ ارکان دولت بادشاہی باشد جمع شوند۔ واز کثرت ورود آدم ہر دیار برائے تحصیل قوت دراں۔ باشندگانش در تحریر و تقریر بہ از ساکنان بلاد دیگر آں ولایت باشند مانند صفاہان ایران کہ مدتہا دارالسلطنت سلاطین صفویہ بود و زبان و بیان سکنہ آنرا بہ از زبان مردم جاہائے دیگر در ایران میگر فتند و می گیرند یا استنبول کہ محل جلوس سلطان روم است۔

چوں بیشتر جائے عیش سلاطین تیموریہ دارالخلافہ شاہجہاں آباد بودہ است و فصیحان و بلیغان و علمائے عالی قدر فریقین و دیگر ارباب فنون لطیفہ و اصحاب علوم شریفہ در آں شہر دلنواز آرام گاہے برائے خود ساختہ بودند ہر چند کہ لاہور و ملتان و اکبرآباد و الہ آباد ہم مسکن بادشاہان صاحب قدرت و شوکت بودہ و عمارات بلند سر بفلک رسانیدہ دریں شہرہا موجود است لیکن برابر نمیتواں گفت زیرا کہ دریں جا سلاطین زیادہ از جاہائے دیگر تشریف داشتہ اند خوش بیانان آنجا متفق شدہ از زبان ہائے متعدد الفاظ دلچسپ جدا نمودہ در بعضے عبارات و الفاظ تصرف بکار بردہ زبانے تازہ سوائے زبانہائے دیگر بہم رسانیدند و بہ اُردو موسوم ساختند۔ ظاہر است کہ از روزے کہ شاہجہاں بادشاہ غازی ایں قطعہ را آباد ساختہ موسوم بشاہجہاں آباد کرد از آں روز تا امروز مسکن بادشاہ ہند است در زمانہ سابق آدم ہر شہر وارد می شد و کسب آدمیت می کرد و باشندہ آنجا بشہر دیگر نمی رفت و اگر بحسب ضرورتے میرفت بزرگ زادہائے عالی قدر آں بلدہ بزیارتش می آمدند و در صحبت او قوانین نشست و برخواست و حرف زدن و دیگر آداب مجلس یاد می گرفتند۔"[1]

---

[1] دریائے لطافت مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۴ء

اُردو کے مشہور انشا پرداز حضرت آزاد تحریر فرماتے ہیں:

"میرے دوستو! تم جانتے ہو کہ ہر شے کی اصلیت اور حسن قبح کے واسطے ایک مقام ایسا ہوتا ہے جیسے سکہ کے لئے ٹکسال، کیا سبب ہے کہ ابتدا میں زبان کے لئے دلی ٹکسال تھی؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ دارالخلافہ تھی دربار ہی میں خاندانی امرا امیرزادے خود صاحب علم ہوتے تھے اُن کی مجلسیں اہل علم اور اہل کمال کا مجمع ہوتی تھیں اسی واسطے گفتگو لباس، ادب، آداب نشست، برخواست بلکہ بات بات ایسی سنجیدہ اور پسندیدہ ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ سب کے دل قبول کرتے تھے ہر شے کے لئے ہمیشہ نئی نئی تراش اور نئی اصلاحیں اور ایجاد و اختراع وہاں سے ہوتے تھے اور چونکہ دارالخلافہ میں ہر شہر کا آدمی موجود تھا اس لئے وہ دلپذیر ایجادیں اور اصلاحیں ہر شہر میں عام ہو جاتی تھیں۔"[1]

ان شہادتوں سے یہ امر پایۂ ثبوت تک پہونچ گیا کہ کسی شہر کا مرکز ہونا کوئی مفروضہ بات نہیں ہے بلکہ ایک قانون کے تحت میں ہے جب تک وہ خصوصیتیں کسی شہر کی خاک سے وابستہ رہیں گی اُسوقت تک وہ زبان کا مرکز رہے گا جب وہ چیزیں وہاں سے چلی جائیں گی مرکزیت بھی رخصت ہو جائے گی چنانچہ یہ چیزیں جب تک دہلی میں رہیں اُسوقت تک اُس کو مرکزیت کا شرف حاصل رہا اور جب وہ چیزیں لکھنؤ چلی آئیں تو اسی کو مرکزیت کا فخر حاصل ہو گیا۔ مولوی محمد حسین آزاد کہتے ہیں:

لکھنؤ کیوں زبان کا مرکز ہے

انھی صفتوں سے لکھنؤ نے سند افتخار حاصل کی لکھنؤ کو دیکھ کر سمجھ لو کہ دلپسند ایجادوں اور رنگین باتوں کا ایجاد ہونا کسی شہر کے اینٹ پتھر کی تاثیر نہیں ہے جہاں شایستہ اور رنگین مزاج لوگ جمع ہونگے اور دلپذیر باتوں کے سامان موجود ہوں گے وہیں سے پھول کھلنے لگیں گے چنانچہ وہی دلی کے لوگ اور اُن کی اولاد تھی کہ جب تباہی سلطنت اور آبادی لکھنؤ کے سبب سے وہاں پہونچے تو چند روز میں ویسی ہی تراشیں وہاں سے نکلنے لگیں لکھنؤ دارالسلطنت ہو گیا اور اس کے ضمن میں زبان بھی دلی کی اطاعت سے آزاد ہو گئی۔"[2]

علم و ادب میں لکھنؤ کا درجہ

ان صفتوں میں لکھنؤ نے کس حد تک ترقی کی اس کو مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔اے کی زبانی سنئے:

"جب سقراط نے ہوش سنبھالا اور آنکھیں کھولیں تو یہ وہ زمانہ تھا کہ خطہ یونان میں علم و ہنر بھیٹ پڑا تھا بڑے بڑے دانشمند، حکیم، فلاسفر، مورخ، شاعر، مقرر اور نثار اُسوقت دارالسلطنت میں موجود تھے اور کسی علم کے سیکھنے کے لئے شہر سے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی صرف بازاروں اور سیر گاہوں میں چہل قدمی کرنا تہذیب انسانیت سکھانے کے لئے کافی تھا۔

اُسی طرح ——— یہ (لکھنؤ) دارالسلطنت بھی شاعری و نثاری کا معدن، فصاحت و بلاغت کی معیار زبان و محاورات کی ٹکسال، شایستگی و تہذیب کا گھر، دولت و ثروت کا سرچشمہ اور حشمت و جاہ، جلال کا خزانہ بایوں کہو کہ اودھ کی دولت مستعجل کا دلکش مستقر تھا جس کے شیدائی دعوے سے کہتے تھے:۔

گو ملی جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ — چونک پڑتا ہوں میں ہر دم کہکے ہائے لکھنؤ

یہ وہ مبارک عہد ہے کہ رئیس و فقیر، امیر و وزیر، شاہ و گدا غرض جس کے دل میں ذرا سا بھی سوز و گداز کا جوہر موجود ہے وہ سخن فہم

---

[1] آب حیات مطبوعہ کریمی پریس لاہور صفحہ ۲۶ — [2] آب حیات صفحہ ۶۶

اور قدران سخن ہیں۔ اُن کی ہمت افزائیوں سے مسرور اور مضامین وخیالات کے اُن گراں بہا انبار سے جو متقدمین اپنے نشان قدم پر چلنے والوں کے لئے چھوڑ گئے ہیں مستفید ہو کر ناسخ، آتش، خلیل، بہار، وزیر، تسلیم، انیس، دبیر وغیرہ نظم اُردو کو معراج کمال پر پہونچانے اور زبان لکھنؤ کو دہلی کی قید سے آزاد کرنے کا بیڑا اُٹھائے ہیں۔

رند کھل جاتا ہے یاں کھوٹے کھرے کا پردا　　لکھنؤ اہلِ ہنر کے لئے ٹکسال ہے آج

اللہ اللہ کیا بابرکت عہد تھا اور کیسے متبرک نفوس تھے جنھوں نے اپنی قیمتی عمریں اصلاح زبان اور اصلاح سخن اور اصلاح مضامین کی نذر کر دیں ـــ غرض اُسوقت قدیم ایتھنس کی طرح ان بزرگوں کی بدولت لکھنؤ میں شاعری اور سخن سنجی کا وہ دریائے مواج جوش زن تھا اور زباں دانی اور مضمون آفرینی کا یہ شہر ایسا مرکز ہو رہا تھا کہ اُس کی دلکش سیر گاہوں اُس کے دلچسپ منظروں اُس کے دلفریب میلوں ٹھیلوں کی بہار دیکھنا بھی انسان کو تہذیب سکھانے اور شاعر بنانے کے لئے کافی تھا ـــ اُسوقت یہاں کی خاک پاک علم وفضل بانٹتی نہیں بلکہ کوڑیوں کی طرح لٹاتی تھی:

سنا رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے　　وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

یہ اُسی زمانہ میں کہا گیا تھا اور حسب حال تھا اور

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور وغلماں میں　　رہیگا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

کچھ دنوں کے بعد ایک پیغمبر سخن کی زبان پر آیا!!

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

اس باکمال عہد میں اور ایسے اہل کمال کے سامنے شاعری میں فروغ پانا تو دشوار تھا لیکن فنِ شعر میں کامل ہو جانا ہر شخص کیلئے ادنیٰ توجہ سے ممکن تھا۔[1]

مولانا عبدالحلیم شرر تحریر فرماتے ہیں:

زبان اور شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم وفضل میں بھی ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی۔ اگر سچ پوچھئے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا، بغداد اور قرطبہ اور اقصائے مشرق کا نیشاپور و بخارا تھا ـــ لکھنؤ کے پہلے مجتہد مولوی دلدار علی[2] صاحب (غفرانمآب) نے چونکہ عراق میں تعلیم پائی تھی لہذا عربی کا نیا ادبی ذوق اپنے ساتھ لائے اور ادبیت میں خاندان اجتہاد اور

---

[1] اُردو شاعری (تذکرہ) صفحہ ۵، تا ۶۰ ـــ [2] ہندوستان میں مذہب شیعہ کے پہلے مجتہد مولوی دلدار علی صاحب ہوئے انھوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں مذہب شیعہ کی تبلیغ کی اور علم کلام ومناظرہ میں معرکہ آرا کتابیں لکھیں جن میں عماد الاسلام شیعی علم کلام میں ایک ایسی کتاب لکھدی ہے جو اس علم کی تمام کتابوں سے بہتر ہے۔ ایک زبردست کارنامہ ہے جس نے اُن کو دنیائے اسلام کا متکلم اعظم منوالیا ہے ہندوستان میں شیعوں کی مذہبی تعلیم سب سے پہلے اُنکی ذات سے ہوئی اسوجہ سے بارھویں صدی ہجری کے مجدد مذہب کہے جاتے ہیں مرنے کے بعد غفرانمآب کے لقب سے مشہور ہوئے انکا نام لیجئے تو اہل علم ہی سمجھ سکیں گے۔ غفرانمآب کہہ دیجئے تو شیعوں کا ایک بچہ بھی سمجھ جائیگا مشہور ہے کہ انھوں نے زیر قبہ حسینی شب قدر کی مخصوص ساعت میں اپنی اولاد میں باقی رہنے کی دعا کی تھی جو مقبول ہوئی۔ یہ قوم بھی دیکھتے ہیں آج ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں اُن کی اولاد اس علم کی مالک سمجھی جاتی ہے ان کے اخلاف میں تقریباً ایک سو سے زائد مصنف ہوئے جن میں بلاشبہ پچاس سے زائد ہندوستان کے اکابر علماء میں سے شمار کئے گئے ہیں، آج بھی بڑے بڑے صاحبان علم اُن کی اولاد میں موجود ہیں یہی علمی گھرانا خاندان اجتہاد کے نام سے مشہور ہے ہندوستان کے تمام علماء خواہ کسی گوشہ کے ہوں اسی خانوادہ کے قائدہ علم کے ریزہ چیں اور زلہ ربا سمجھے جاتے ہیں۔

لکھنؤ کے شیعہ علماء کو فرنگی محل[1] والوں پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی اور آج تک حاصل ہے۔ علمائے شیعہ کے ادبی مذاق نے لکھنؤ کو ادب کی تعلیم کا اعلیٰ ترمرکز بنا دیا[2]

غدر کے بعد مرزا غالب مرحوم نے میر مہدی مجروح کو ایک خط لکھا ہے جس میں لکھنؤ کی زبان کے مستند ہونے کی یہ وجہ بتائی ہے کہ وہاں ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مرزا غالب کے زمانہ کی طرح لکھنؤ آج بھی اہلِ کمال کا مامن و زیر زادوں کا مولد شاہزادوں کا مسکن اور علماء کا مرکز ہے اسی طرح اطبا کے متعدد گھرانے شعرا کے مختلف خاندان لکھنؤ میں آباد ہیں اور جب تک یہ خصوصیتیں لکھنؤ کو حاصل رہیں گی اُسوقت تک وہ زبان کا مرکز رہے گا جس پر کسی کے ماننے نہ ماننے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ ہمارا یہ دعوے صرف زبانی نہیں ہے بلکہ کچھ تحریری ثبوت بھی موجود ہیں اُردو کے مشہور شاعر و انشا پرداز پنڈت برج نرائن چکبست غالب کے تقریباً چالیس برس بعد لکھنؤ کی یہ حالت بیان کرتے ہیں:۔

اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کی اس مٹی ہوئی حالت پر بھی ایک عالم ہے۔ اس شہر مرحوم کے باشندوں کا طرز معاشرت اُسکی گزشتہ عظمت کی یاد دلاتا ہے اور دل میں درد محبت پیدا کرتا ہے ہاں نگاہ عبرت کا ہونا لازمی ہے۔ میرے دوستو! یہاں کی خاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ کبھی امیروں اور شہزادوں کی آنکھوں کا سرمہ تھی یہاں کی عالیشان گرشکستہ عمارتوں کے ٹوٹے چھوٹے در و دیوار زمانہ کے نشیب و فراز کی تصویر ہیں ؎

ہر کجا خشت کہن بینی دریں ویرانہ ہست فرد دفتر احوال صاحب خانہ

گو کہ یہاں کے شرفا فلک زدہ ہیں اور زمانہ نے اُن کے جاہ و جلال کو خاک میں ملا دیا ہے مگر ان میں بوئے ریاست پائی جاتی ہے وہ ایک خاص وضع کے پابند ہیں جس کو آئین شرافت سمجھتے ہیں اور ایک خاص تہذیب کی یادگار ہیں ؎

اسلاف کے کچھ اثر ہیں باقی اس راکھ میں کچھ شرر ہیں باقی،
گو خوار ہوئے ہیں خو وہی ہے مرجھا گئے پھول بو وہی ہے،

اُن کی تقریر و گفتگو شستگی و پاکیزگی کا معیار ہے، اُن کی نشست و برخواست کا طریقہ سلیقہ و امتیاز کا دستور العمل ہے ان لوگوں کو جنھوں نے نئی تہذیب میں نشو و نما پائی ہے اور تہذیب قدیم کے مذاق سے بالکل ناآشنا ہیں پرانی روشوں میں سوائے عیوب کے جوہر نظر نہ آئے مگر اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس زوال کی حالت میں بھی لکھنؤ ایک مٹی ہوئی تہذیب کی عبرتناک تصویر ہے جس کا رنگ ابھی بالکل نہیں اُڑ گیا ہے باوجود ہزاروں عیوب کے یہاں کے باشندوں کے طرز معاشرت میں اب بھی ایک لطافت ہے جو بیرونجات کے رہنے والوں کو نصیب نہیں۔ زبان کی شستگی، طبیعت داری علو ہمتی، جوہر شناسی ادب و سلیقہ حسن تقریر تو گویا شرفائے لکھنؤ

---

[1] عہد اکبری میں ایک فرانسیسی تاجر نے لکھنؤ میں گھوڑوں کی تجارت شروع کی اور یہیں قیام کر کے چوک کے متصل چار عالیشان عمارتیں بنوائیں جب اُسکی رت قیام ختم ہو گئی اور دوبارہ اجازت نہ ملی تو یہ مکان نزول سرکار ہو گئے۔ اورنگ زیب کے عہد میں جب ملا نظام الدین سہالوی نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنا چاہی تو عطیہ شاہی کے طور پر یہ چاروں مکان انھیں دیدئے گئے۔ یہ مکانات اپنے گرد و پیش کے کئی مکانوں کے ساتھ فرنگی محل کہلاتے ہیں علمائے فرنگی محل انھیں ملا صاحب کی اولاد ہیں جو حضرات اہل سنت میں علمی کمالات کے ساتھ صوفیانہ برکتوں کے مالک بھی سمجھے جاتے ہیں شاہی زمانہ میں خاندان اجتہاد اور فرنگی محل کے علماء سے علمی نوک جھوک بھی ہوتی رہتی تھی اسی کے ساتھ آپس میں دوستانہ اتحاد بھی تھا لیکن اس دور بیداری میں بہت مغائرت ہے۔ [2] گزشتہ لکھنؤ ص ۱۰۲ تا ۱۰۳

کی گھٹی میں پڑی ہے"[1]

مولانا عبدالحلیم شرر تحریر فرماتے ہیں:

آداب معاشرت میں ایک اہم چیز گفتگو اور طرز کلام ہے دُنیا میں ہر شخص کی شایستگی اور ادبی قابلیت کا پہلا اندازہ اُسکے الفاظ اور اُس کے انداز گفتگو سے ہوتا ہے دنیا کی ہر اقبال مند قوم پہلے اپنی زبان کی اصلاح کرتی ہے اور اُسے ترقی دیتی ہے ——

اس بارہ خاص میں اہل زبان لکھنؤ اور یہاں کے شایستہ لوگوں کو جو کمال حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی اور شہر والوں میں نظر نہ آئے گا اگرچہ موجودہ تعلیم و تہذیب نے ایک حد تک یہ خوبی ہر جگہ انداز گفتگو میں پیدا کر دی ہے مگر انگریزی اثر سے معرا کر کے دیکھئے تو بالذات یہ شائستگی و شستگی اہل زبان لکھنؤ ہی کا حصہ نظر آئیگی باہر کے لوگ اس کا یہاں تک لوہا مانے ہوئے ہیں کہ لکھنؤ والوں کے سامنے گفتگو کرتے جھجھتے ہیں اور جس قدر شایستگی اُن میں ہے اُس کو بھی بھول جاتے ہیں اس کے بعد جب اپنی صحبتوں میں بیٹھتے ہیں تو یہ کہہ کے اپنی کمزوری کا الزام دور کرتے ہیں کہ ہم سادگی سے صاف صاف باتیں کرتے ہیں اور ہمیں لکھنؤ والوں کی سی چیں چناں نہیں آتی۔ مگر دراصل یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے، میں نے ایرانیوں کو دیکھا کہ اُن کے سامنے ہندوستانی بات کرنا بھول جاتے ہیں۔ انگلستان میں دیکھا کہ فرانسیسیوں کے سامنے انگریزوں کی زبان سے ایک لفظ بھی نکلنا مشکل ہو جاتا ہے اسی طرح عربوں کی طلاقت لسانی کی کبھی یہ حالت تھی کہ اُن کے سامنے غیر ملک والوں کی زبان نہ کھل سکتی تھی —— بعینہٖ یہی حال ہندوستان کے ہر شہر کے مقابل لکھنؤ والوں کا ہے کہ وہ فصاحت اور بذلہ سنجی میں سب کو دبا کے صحبت پر چھا جاتے ہیں اور اپنے سامنے کسی کو زبان نہیں کھولنے دیتے۔

شائستگی زبان میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ مخاطب کو کن ضمائر سے یاد کیا جائے اور سب زبانوں میں مخاطب کے لئے دو ضمیریں ہیں ایک واحد کی اور ایک جمع کی اور معزز مخاطب کے لئے ہر زبان میں تعظیماً جمع کی ضمیر استعمال کی جاتی ہے —— اُردو میں مخاطب کے لئے واحد کی تو ایک ہی ضمیر "تو" ہے مگر جمع کی دو ضمیریں ہیں "تم" اور "آپ" اور ان تینوں ضمیروں کے لئے مخاطب کا درجہ اور مرتبہ مقرر ہے —— اُردو زبان میں اور خاص لکھنؤ والوں میں مخاطب کے اتنے ہی درجے نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کے بہت سے الفاظ ہیں —— جو لکھنؤ والوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اور ان کا صحیح استعمال جس قدر اہل لکھنؤ جانتے ہیں اور کسی دوسرے شہر کے لوگ نہیں جانتے۔

مزاج پرسی کو دیکھئے ہر زبان میں اس کے لئے معمولی الفاظ ہیں مگر اُردو میں ادب و احترام کی نگہداشت کے لئے مزاج عالی، مزاج مبارک، مزاج اقدس، مزاج مقدس، مزاج معلیٰ وغیرہ کہکے معزز مخاطب کی خیریت دریافت کرتے ہیں یہ الفاظ اگرچہ اب ترقی اُردو کے ساتھ ہر جگہ اور ہر شہر میں پھیل رہے ہیں مگر اُن کے استعمال میں جو اجتہادی ملکہ شرفائے لکھنؤ کو حاصل ہے کسی اور جگہ کے لوگوں کو نصیب نہیں ہو سکتا۔

شرفائے لکھنؤ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ش، ق درست رہے گا اور تمام عربی عرفوں کو حتی الامکان اُن کے اصلی مخرج سے ادا کریں گے، فارسی ترکیبوں میں اضافت نمایاں طور پر ادا کی جائے گی، علماء اور ذی علم لوگوں سے باتیں کریں گے

---

[1] مضامین چکبست مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد صفحہ ۴۰ تا ۴۱۔

تو عربی و فارسی الفاظ کو زیادہ استعمال کریں گے اور اُن کے صحیح تلفظ سے ادا کریں گے، اطبا سے گفتگو ہوگی تو عربی کے طبی مصطلحات کو کام میں لائیں گے جاہل نوکروں سے اور عوام سے بات کریں گے تو عربی الفاظ سے بچیں گے عورتوں سے بات چیت ہوگی تو اُن کے مذاق کے محاوروں اور مثلوں کو گفتگو میں صرف کریں گے خرد بزرگ سے ادنیٰ اعلیٰ سے یا عامی عالم سے گفتگو کریگا تو ہر لفظ اور ہر فقرے میں ادب و تعظیم کا خیال رکھے گا آواز مناسب درجے تک پست اور نیچی رہے گی، اسی طرح بزرگ خردوں سے اعلیٰ طبقے والے ادنیٰ لوگوں سے علماء عوام سے بات کریں گے تو اُن کے لہجہ اُن کے انداز اور اُن کے الفاظ میں شفقت و محبت کے جذبات مضمر ہوں گے - ان باتوں کا لحاظ رکھنے اور مذکورۂ بالا ادب و تعظیم کے الفاظ و ضمائر استعمال کرنے سے اہل لکھنؤ کی زبان اس قدر شستہ اور رفتہ ہوگئی ہے کہ یہاں کے عوام اور جہلا دوسرے شہروں کے اکثر شعراء و فصحا سے زیادہ اچھی اُردو بولتے ہیں اور جو شائستگی و تمیز داری اُن سے ظاہر ہوجاتی ہے کسی اور مقام کے قابل و ذی علم لوگوں سے بھی نہیں ظاہر ہوسکتی ـــ آداب معاشرت میں دوسری چیز طریقہ مذاق ہے ـــ جو زبان جتنی زیادہ ترقی کرتی ہے اُسی قدر اس میں مذاق و ظرافت کے پہلو بڑھتے جاتے ہیں ـــ اس کا جیسا اچھا سلیقہ لکھنؤ کے عوام الناس کو ہے دوسری جگہ کے خاص لوگوں میں بھی نظر نہیں آتا ـــ اہل لکھنؤ میں شوخی و ظرافت بہت ہے وہ اپنے کلام میں صدہا عنوانوں سے ظرافت پیدا کردیا کرتے ہیں اور جو اس فن میں جتنا زیادہ کمال رکھتا ہے اتنا ہی زیادہ اہل سخن کی محفلوں میں چمکتا اور ممتاز ثابت ہوتا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اور مقامات کے لوگوں میں یہ ملکہ نہیں ہے اور کثرت سے ہے ـــ مگر لکھنؤ والوں میں یہ ملکہ طبیعت ثانویہ بن کے اُنکی فطرت اور جبلت بن گیا ہے اور لطافت کلام کے ساتھ بذلہ سنجی و ظرافت میں جیسا بے تکلف اور ستھرا مذاق اُنکا نظر آئیگا اوروں کا نہیں ہوسکتا[1]

لکھنؤ کی اس اعلیٰ تہذیب و معاشرت نے اس درجہ ترقی کی کہ ضرب المثل ہوگئی کسی کے متعلق اتنا کہدینا کہ آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں یہ بتا دینا ہے کہ آپ تہذیب و شائستگی کا معیار ہیں چنانچہ زمانہ حال کے زندہ مصنف سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم - اے لکچرار اُردو الہ آباد یونیورسٹی اپنی کتاب مختصر تاریخ ادب اُردو میں مہدی حسین صاحب ناصری کے متعلق لکھتے ہیں:

"تہذیب و شائستگی کے متعلق غالباً اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ آپ لکھنؤ کے رہنے والے تھے"

یہی شائستگی اور سلیقہ مندی جو اہل لکھنؤ کا مایۂ امتیاز ہے باہر والوں میں نایاب ہے مجھے اکثر اس کا تجربہ ہوا ہے کہ جو شائستگی اور ادیبانہ صلاحیت لکھنؤ کے عوام سے ظاہر ہوئی وہ دوسری جگہ کے خواص سے نہیں ہوسکی۔

جونپور میں میرے ایک عنایت فرما ہیں جو انگریزی میں ایم - اے ہیں اُردو سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں شاعر ہیں اور تنہا نہیں گھر بھر شاعر ہے ادبی ذوق پشتوں سے اُن کے گھر میں ہے میں ایک ضرورت سے جونپور گیا تھا ایک کتب فروش کی دوکان پر کھڑا تھا ہاتھ میں ایک ہندی کا اخبار تھا جس کی تہ میں ایک تصویر تھی اتنے میں ہمارے دوست بھی آپہونچے بہت خندہ جبینی سے ملے اخبار پر جو نظر پڑی تو اُس کی طرف اشارہ کرکے فرمایا "آپ اس کو سمجھ لیتے ہیں؟" میں نے مسکرا کے کہا کہ تصویر کی حفاظت کے لئے پورا اخبار لے لیا ہے ورنہ اتنا سمجھ دار نہیں ہوں - ابھی وہ ہٹے ہی تھے کہ اتفاق سے ایک لکھنوی صاحب سے ملاقات ہوگئی یہ ایک عینک فروش تھے اپنی تجارت کے سلسلہ میں جونپور آئے تھے اور کسی سرا میں مقیم تھے مجھے دیکھ کے وہ بھی اس دوکان پر آگئے استفسار حالات کے بعد ہندی کا اخبار میرے ہاتھ میں دیکھ کے فرمانے لگے "ماشاء اللہ ہندی سے بھی آپ کو ذوق ہے" اُن کے اس فقرے میں استفہام

[1] گزشتہ لکھنؤ

کی شان نہ تھی بلکہ اظہار واقعیت کا انداز تھا یعنی ایسا ہی حالانکہ ان کا مقصود بھی یہی دریافت کرنا تھا کہ تم ہندی جانتے ہو یا نہیں اسکو کس حسن سے دریافت کیا آسوقت لکھنؤ کی قدر ہوئی - یہی وہ خوبیاں ہیں جنھوں نے لکھنؤ کی تہذیب کا مرکز اور شائستگی کا مرکز بنا دیا ہے مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں :-

" فصاحت زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں ایسی مضبوط جگہ پکڑلی تھی کہ چند ہی روز میں شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضع داری بن گیا اور شعراء کی یہاں اس قدر کثرت ہوگئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں نہ ہوئی ہوگی، عورتوں تک میں شعر و سخن کا چرچا ہوا اور جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی"

آج بھی لکھنؤ کے جہلا جس شاعرانہ انداز میں بات کرتے ہیں دوسری جگہ کے اہل علم نہیں کر سکتے جامن کی فصل میں جسوقت ایک جامن بیچنے والا اپنی مترنم آواز میں کہتا ہے : "کالی گھٹا کے کالے پھلیندے" - تو اُس کی اس آواز پر ہزاروں شعر نثار کر دینے کو جی چاہتا ہے اور گرمیوں کی فصل میں برف کی قتلی بیچنے والے کی یہ صدا : "یہ کس کی محبت میں گھل رہی ہے" اپنے اندر جذب و اثر کا ایک عالم رکھتی ہے اسی طرح گولر بیچنے والے کا یہ کہنا : "گولر کیا ہیں شہد کی گپیاں ہیں"

اور پان بیچنے والے کا یہ مصرعہ : "کرتی ہے سرخرو وہ کنوری ہے پان کی" — دماغ کی ادبی اور شاعرانہ ساخت کا پتا دیتا ہے ایسی شاعرانہ صلاحیت نے لکھنؤ کے عوام میں ظاہر ہوکے معاشرت کی تمام چیزوں میں جو تکلف اور نفاست پیدا کر دی ہے دوسری جگہ کے خواص بھی اس سے محروم ہیں - مثلاً جیٹھ بیساکھ کی گرمیوں میں کبڑے کسی پھیلے ہوئے ظرف میں کینے کے پتے بچھا کے اُس پر عود بگڑ کی نفیس چھلی ہوئی گنڈیریاں رکھکے اوپر سے برف کا ایک ڈلا رکھدیتے ہیں اور دو چار گلاب کے پھول ارد گرد رکھکے بیچتے ہیں تو دیکھنے سے آنکھوں اور کلیجے میں ٹھنڈک پہونچتی ہے اور خواہ مخواہ کھانے کو جی چاہتا ہے دوسری جگہ ان باتوں کو آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں اور نہیں پاتیں - یہ باتیں عوام سے تعلق رکھتی ہیں خواص کی نفاست اور متانت کا کیا ذکر جن کی مجلس میں بے تحاشا ہنسنا بے باکانہ گفتگو کرنا، بے ڈھنگے پن سے بیٹھنا، منھ کھول کے جماہی لینا، بے منھ پر رومال رکھے زور سے چھینکنا، بیہودہ مذاق کرنا، بازاریوں کے الفاظ زبان پر لانا، غرض ہر وہ بات جس میں سنجیدگی و متانت نہ ہو آئین ادب کے خلاف ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ مغرور اور خشک ہوں گے - مگر آپ اُن کو شاخ ثمردار کی طرح خمیدہ پائیں گے اُن کے چہرے معتدل تبسم سے شگفتہ، جبین وسعت اخلاق سے کشادہ گردنیں خاکساری سے جھکی ہوئی ہوں گی، اُن کی محبت آمیز باتوں میں وہ شیرینی کہ سامعہ کو فرط تسنیم کی موجوں میں ڈوب جائے غرض طرز معاشرت کی یہی لطافتیں ہیں جنھوں نے لکھنؤ کو اہل دل کی جنت بنا دیا ہے -

راجہ درگا پرشاد لکھتے ہیں کہ عارف شاہ عارف ایرانی محمد شاہ بادشاہ ایران کے عمائد دولت میں تھے اُن کے کلام کی نمکینی مائدہ فصاحت کا نمک اور شیرینی کلام بلاغت کی حلاوت افزا تھی صوفیانہ اور دردانگیز اشعار کہتے تھے انھوں نے اُٹھتی جوانی میں دنیائے کو ٹھوکر مار کر سیاحت اختیار کی ..... ہندوستان کے شہروں میں خصوصیت کے ساتھ اُن کو لکھنؤ اس قدر پسند آیا کہ اکثر یہیں رہا کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں :

بہ ہندوستاں ندیدم موضع دلچسپ چوں لکھنؤ اگرچہ در طریق سیر تا چنیاپٹن رفتم

مرزا غالب نے غدر کے بعد عام تباہی کے عالم میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط لکھا ہے جس میں لکھنؤ کی حالت بہت مضطرب لکھی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنکی نظر میں لکھنؤ کیا تھا : "ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اُس بہارستان پر کیا گزری"

ایک شبہ کا ازالہ اور زبان کی ترقی کے اُصول

ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ ان باتوں سے زبان کو کیا تعلق اس شبہ کو دور کرنے کے لئے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہر زبان کی ترقی بلکہ زندگی اُسکی لفظوں، ترکیبوں، اور اسلوبوں کی اصلاح پر منحصر ہے اس اصلاح کا واحد اُصول یہ معلوم کرنا ہے کہ کس لفظ اور کس ترکیب میں بھونڈا پن ہے اور کس پہلو سے تراش کے اُس کو خوشنما بنایا جا سکتا ہے یہ انھیں لوگوں کا کام ہے جن کی طبیعت میں پاکیزگی نفاست لطافت اور جدت کا جوہر موجود ہو اہل لکھنؤ میں یہ بات بدرجۂ کمال موجود ہے انھوں نے ہر شعبۂ زندگی میں وہ تکلف اور جدت پیدا کی ہے کہ دنیا دنگ ہو گئی ہم تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتے جس کو اس موضوع پر تفصیلی اطلاع حاصل کرنا ہو وہ گزشتہ لکھنؤ کا مطالعہ کرے۔ شاعری کے متعلق رام بابو صاحب سکسینہ کی زبانی اتنا سن لیجئے:

"شعر کا اتنا چرچا پھیلا کہ جا بجا مشاعرے ہونے لگے۔ امرا اور رؤسا اور عوام الناس بھی شاعری کے دیوانے تھے عمدہ اشعار پڑھکر اور سن کر لوٹ جاتے تھے۔ مشاعروں کی محفلیں ماہوار اور ہفتہ وار سے ترقی کر کے اکثر جگہ روزانہ ہوتی تھیں جس میں شعرا اپنی عمدہ غزلیں پڑھتے تھے اور سامعین کی تعریف سے اُن کے دل بڑھتے تھے اس مقابلہ سے یہ فایدہ ضرور تھا کہ علاوہ کلام کی کثرت کے ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور یہی فوقیت اور سرسبزی کا خیال لوگوں کے لئے مایۂ ناز تھا"[1]

یہ ذوق ترقی کرتے کرتے اس حد پر پہونچ گیا کہ بقول حضرت شرر عورتوں تک میں اس کا چرچا ہوا اور عوام کی باتوں میں شاعری کی جھلک نظر آنے لگی اور سچ پوچھئے تو در و دیوار سے شعر برسنے لگے شادی و غم کے رقعے مجلس و محفل کے دعوت نامے ہر چیز شعر میں ہونے لگی انتہا ہو گئی کہ اخبار تک نظم میں نکلنے لگا اس اخبار کا نام نظم الاخبار تھا اور برسوں نکلتا رہا اس سے بھی بڑھ کے بعضوں نے یہ جدت کی کہ بات چیت تک شعر میں شروع کر دی۔ اسوقت بھی ایک بزرگ[2] ہیں جن کی گفتگو کا زیادہ تر حصہ نظم میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا تحریر فرماتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے رہنے والے موزوں طبع ہوتے ہیں ——— اصلی سبب سوسائٹی ہے نہ طبیعت۔ لکھنؤ کی سوسائٹی میں اس قابلیت کے ظاہر ہونے کے اسباب پیدا ہو گئے ہیں[3]"

یہی سوسائٹی کی شاعرانہ قابلیت و استعداد تھی جس نے زبان میں ایسی ایسی اصلاحیں کیں جن پر اہل ذوق ہمیشہ تحسین و آفرین کے پھول برساتے رہیں گے۔ رام بابو صاحب سکسینہ تحریر فرماتے ہیں:

"لکھنؤ کے شعرا اور عوام الناس نے بعض الفاظ و محاورات کو خاص خاص محل پر استعمال کرنا شروع کیا اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ محل استعمال دہلی کے طریقہ استعمال سے بہتر اور موزوں تر تھا"[4]

اس دعوے میں اہل لکھنؤ کے حق بجانب ہونے کی تصدیق حضرت آزاد دہلوی یوں کرتے ہیں:

"جب اُن کے (اہل لکھنؤ کے) اور دہلی کے محاورے میں اختلاف ہو گا تو اپنے محاورے کی فصاحت پر دلایل قایم کریں گے

---

[1] تاریخ ادب اُردو صفحہ ۲۵۹ تا ۲۶۰ — [2] آپ کا نام کاظم حسین تخلص مقدس ہے خاندانی نواب زادے ہیں گورنمنٹ سے وثیقہ ملتا ہے عربی فارسی کی تحصیل کی ہے اور اس میں بھی علوم دینیہ کی طرف زیادہ توجہ رکھی اس وجہ سے بجائے نواب کے مولوی کہے جاتے ہیں۔ فنون سپہ گری میں کمال حاصل ہے وکٹوریہ اسٹریٹ میں افضل محل کے سامنے مکان ہے — [3] شریف زادہ (ناول) نیشنل پریس الہ آباد ۱۹۲۸ء — [4] تاریخ ادب اُردو صفحہ ۲۶۳

بلکہ انھیں کے بعض نکتوں کو دہلی کے اہلِ انصاف بھی تسلیم کریں گے[1]

انھیں باتوں کا نام زبان کی اصلاح اور ترقی ہے اور یہ کام مخصوص اہلِ لکھنؤ کا ہے جو کسی دوسرے شہر کے باشندوں کے بس کی چیز نہیں ہے

زبان میں لہجہ کی اہمیت

ان تمام باتوں کے ساتھ ایک اور چیز لہجہ بھی ہے جس کو اہلِ زبان کے ساتھ خاص خصوصیت حاصل ہے میر انشاء اللہ خاں انشا کہتے ہیں:

"از اُردو تنہا الفاظ اُردو مقصود نیست لہجہ ہم در دو شریک است کہ آں اصالت اُردو باشد دریں صورت ہر کہ لفظ و لہجہ اُردو ہر دو درست داشتہ باشد اُستاد کامل است[2]"

الفاظ کی اصلی ساخت کا بقا لہجہ پر منحصر ہے، اور لفظوں میں آواز کہاں سے لاؤں جو بتاؤں کہ لہجہ سے لفظوں کا تلفظ کیونکر بدل جاتا ہے۔ پھر بھی کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح مطلب ادا کرسکوں مثلاً "کیوں" بمعنی چرا، اہلِ لکھنؤ کے لہجہ میں کچھ اور تلفظ رکھتا ہے اور دوسری جگہ کے لوگ اس کا دو طرح تلفظ کرتے ہیں جس فرق کو تحریر میں نہیں ظاہر کیا جا سکتا اسی طرح اکثر اطراف کے لوگ کاف بیانیہ (کہ) کو "کی" کہتے ہیں۔ پیسا میں سا کا تلفظ تو ہر جگہ یکساں ہے مگر "پے" کے تلفظ میں اختلاف، اہلِ لکھنؤ پے بروزن شے (چیز) کہتے ہیں، اور اکثر مقامات کے لوگ "پئی" بروزن "حی" (زندہ) کہتے ہیں ایسے بے شمار الفاظ ہیں جن کے استعمال میں اہلِ لکھنؤ امتیازی شان رکھتے ہیں لیکن یہ ایسا نازک فرق ہے جو تحریر کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔

لفظوں کی حرکت کا فرق

لہجہ سے مشابہ بلکہ اُس سے واضح ایک چیز تغیرِ حرکت ہے یعنی اکثر مقامات کے لوگ اپنے لب و دہان کی ساخت کے موافق اہلِ لکھنؤ کی تلفظ کے خلاف الفاظ کی حرکت بدلنے پر مجبور ہوتے ہیں مثلاً جاڑے کو جَڑا آٹے کو اٹا سہارنپور اور اُس کے اطراف میں عوام و خواص سب کی زبان پر ہے پنجاب اور اُسکے اطراف میں دُفتر کو دَفتر، خبر کو خَبر، حسن کو حَسن کہتے ہیں آگرہ اور اُس کے نواح میں ضمیر متکلم "میں" کو مَیں تلفظ کرتے ہیں اسی طرح پے کو پَے۔ یہ ایسے فرق ہیں جو آب و ہوا کے اثر سے زبانوں میں پیدا ہو گئے ہیں، اہلِ لکھنؤ اسی کو زبان کی موچ کہتے ہیں ——— انشاء اللہ خاں کہتے ہیں:

"ساکنان بلاد دیگر ہر چند بعضے روزمرہ خود را در صحت اہلِ دہلی رسانیدہ اند لیکن از لہجہ مجبور اند ہمیں کہ حرف می زنند شناختہ می شوند[3]"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"و باشندۂ شہر دیگر اگر عمر خود را در تصحیح اُردو بگذارند از لہجہ اصلی گریزش ناممکن است[4]"

ایک مقام پر اسی مطلب کو یوں ادا کرتے ہیں:

"کلام باشندہ ہر شہر دلالت کند بر مولد و موطن[5]"

انھیں وجوہ سے دوسرے شہر کے اہلِ علم اپنے کو مقلد اور متبع سمجھنے پر مجبور پاتے ہیں لیکن یہ انہی لوگوں کا کام ہے جن کو خدا نے ذہنِ مستقیم اور ذوقِ سلیم فرمایا ہے اور وہ ایک بات کی حقیقت و اہمیت سمجھ سکتے ہیں۔ شمس العلما خان بہادر نواب

---

[1] آبِ حیات ص ۳۴۰ — [2] [3] [4] [5] دریائے لطافت۔

امداد امام اثر عظیم آبادی تحریر فرماتے ہیں:

"ہر چند یہ زبان ہندوستان کے اکثر حصوں میں بولی جاتی ہے مگر اس کے صحیح بولے جانے کی نسبت صرف دہلی اور لکھنؤ کی طرف کی جاتی ہے ـــ ان دونوں شہروں کے علاوہ اور جگہوں کے اُردو بولنے والے اہل زبان کہے جانے کا حق نہیں رکھتے مثلاً ساکنین صوبہ بہار کہ ہر چند زبان اُردو ہی بولتے اور لکھتے ہیں مگر اُن کی زبان کو کسی طرح سند نہیں مانتے حقیقت حال بھی یہی ہے کہ ہم بہاریوں کی زبان اہل لکھنؤ یا اہل دہلی کو پسند نہیں ہو سکتی ہم لوگوں کا بڑا کمال یہ ہے کہ زباندان کہلائیں اہل زبان ہونا تو تمامتر خارج از امکان ہے ـــ بہر حال جاننا چاہئے کہ لکھنؤ اور دہلی ہی میں سندی اُردو بولی جاتی ہے"[1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے اُن حصوں میں جہاں اُردو بولی جاتی ہے مستند غزل سرائی صرف دو جگہوں کی سمجھی جاتی ہے یعنی دہلی اور لکھنؤ ـــ زبان کے اعتبار سے تو یہ خیال بالکل صحیح ہے کس واسطے کہ ان دونوں جگہوں کے برابر کہیں کی زبان نہیں مانی جا سکتی"[2]

جن لوگوں کو خدا نے علم و عقل سے کچھ بھی بہرہ عطا نہیں فرمایا وہ زبان کے ان نکتوں سے بے خبر ہیں اس لئے مرکزیت کے منکر ہیں لیکن جو زبان کے گروں سے واقف ہیں وہ حضرت اثر کی تائید پر مجبور ہیں۔

زبان کی مرکزیت کا دوسرا پہلو

اب اس مسئلہ کو دوسرے رُخ سے دیکھئے۔ یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ کلام میں فصاحت روزمرہ اور محاورے کی پابندی سے پیدا ہوتی ہے۔ مولانا حالی کہتے ہیں:

"کلام میں جس قدر روزمرہ کی پابندی کم ہوگی اُسی قدر وہ فصاحت کے درجہ سے ساقط سمجھا جائے گا ـــ الغرض نظم ہو یا نثر دونوں میں روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو نہایت ضروری ہے"[3]

چودھری نظیر الحسن صاحب فوق تحریر فرماتے ہیں:

"روزمرہ کی پابندی تمام اقسام کلام مثل تحریر و تقریر نظم و نثر میں نہایت ضروری ہے جس قدر کسی کلام میں روزمرہ کا لحاظ کیا جائے گا اسی قدر فصاحت کے معیار پر پورا اُترے گا اور مقبول طبائع خاص و عام ہوگا بغیر محاورے کے کوئی کلام فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ پایہ پر نہیں پہونچ سکتا ہے لیکن اگر روزمرہ کی پابندی نہ ہوگی تو درجہ فصاحت سے گر جائیگا"[4]

اب غور طلب یہ بات ہے کہ روزمرہ کے کیا معنی ہیں کیا وہ لفظیں اور ترکیبیں جو معمولاً سب کی زبان پر آتی رہتی ہیں روزمرہ میں اگر ایسا ہی ہے تو آوت ہیں، جات ہیں، کھات ہیں، پیت ہیں، اس طرح کی بے شمار لفظیں ہم برابر سنا کرتے ہیں۔ کیا اس روزمرہ اور محاورے کی پابندی فصاحت کی ضامن ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہر صحیح الحواس جواب میں نہیں کہے گا تو پھر کیا ادباء، شعراء، رؤسا، کی زبانوں پر جاری رہنے والی لفظیں اور ترکیبیں مراد ہیں تو مجھے ایسے ادبا شعرا اور رؤسا سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جن کی گفتگو با آواز بلند اس کو غلط کہتی ہے۔ سب کو جانے دیجئے مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ذات گرامی سے کون نہیں واقف ہے نظم و نثر دونوں میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے

---

[1] کاشف الحقایق صفحہ [2] کاشف الحقایق صفحہ ـ [3] مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۳ ـ [4] المیزان صفحہ ۶۱

ان کا ایک شعر ہے :

ہوں ہوں کرتی تھپکتی جاتی ہے ہولے ہولے سرکتی جاتی ہے

بہت سے اہلِ زبان بھی ہولے ہولے کا مطلب نہ سمجھ سکیں گے مختلف مقامات کے شعراء اور ادباء کے یہاں اس طرح کی بہت سی لفظیں ملتی ہیں تو اسی روزمرہ کی پابندی سے کلام میں فصاحت پیدا ہوتی ہے یقیناً اس کا جواب بھی آپ نفی میں دیں گے تو پھر کس کے روزمرہ اور محاورے کی پابندی کرنا چاہئے۔ آپ کو شاید یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ عام زبانوں پر جاری رہنے والی لفظیں اور ترکیبیں روزمرہ اور محاورہ کی تعریف ہی سے خارج ہیں بلکہ کچھ مخصوص لوگوں کی زبان پر جاری رہنے والی لفظیں اور ترکیبیں روزمرہ و محاورہ ہیں اور کلام کو فصیح بنانے کے لئے انھیں کی پابندی لازم ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ مخصوص افراد کی زبان سے جو لفظ جس طرح نکلے وہی صحیح ہے اور اُس کے خلاف غلط اور یہیں سے تقلید اور مرکز کی ضرورت ثابت ہوگئی، یعنی ہم کو کچھ لوگوں کے تلفظ کو اور محاوروں کو معیاری ماننا پڑا، لیکن وہ کون لوگ ہیں اس کا پتہ لگالینا آسان ہے۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں :

"جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہلِ زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتے ہیں اُن کو روزمرہ کہتے ہیں"[1]

مولانا حالی کہتے ہیں :

"اصطلاح میں خاص اہلِ زبان کے روزمرہ یا بول چال کا نام محاورہ ہے"[2]

چودھری نظیر الحسن صاحب فوق لکھتے ہیں :

"جو الفاظ اور ترکیبیں اہلِ زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوں اُن کو روزمرہ کہتے ہیں اور اہلِ زبان کی بول چال و اسلوب بیان ہی کا نام محاورہ ہے"[3]

اہلِ زبان کون ہیں اس کا فیصلہ بھی مولانا حالی کی زبان قلم سے سنئے :

"ہندوستان میں جیسا کہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے صرف دو شہر ہیں جہاں کی اُردو معتبر سمجھی جاتی ہے دلی اور لکھنؤ۔ دلی کی زبان اس لئے ٹکسالی زبان سمجھی جاتی ہے کہ اُردو کا حدوث اور نشو و نما اسی خطہ میں ہوا ہے لکھنؤ کی زبان کو اسواسطے مستند مانا جاتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کی ابتداء سے شرفائے دہلی کے بے شمار خاندان ایک مدت دراز تک لکھنؤ میں جا جا کر آباد ہوئے اور ہمیشہ کیلئے وہیں رہ پڑے پس ہندوستان کے کسی شہر کو اہلِ دہلی سے اس قدر میل جول کا موقعہ نہیں ملا جس قدر لکھنؤ کو ملا ہے یہاں تک کہ دونوں شہروں کی زبان میں ایک خاص مماثلت پیدا ہوگئی ہے اور خاص الفاظ و محاورات کے سوا دونوں کے بول چال اور لب و لہجہ میں کوئی معتدبہ فرق نہیں معلوم ہوتا"[4]

مرزا غالب کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو :

"جفا کے مؤنث ہونے میں اہلِ دہلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق ہے کبھی کوئی نہ کہے گا کہ جفا کیا، ہاں بنگالہ میں جہاں بولتے ہیں کہ ہتنی آیا اگر جفا کو مذکر کہیں تو کہیں"[5]

اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر جگہ کی زبان میں مقامی الفاظ موجود ہیں اور وہ ٹکسالی نہیں اس لئے نہ ہر جگہ کی اُردو معتبر ہے نہ ہر جگہ کے لوگ اہلِ زبان

---

[1] موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۳۰ ۔ [2] مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۰ ۔ [3] المیزان صفحہ ۲۰ ۔ [4] مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۱۴-۱۱۵ ۔ [5] ادبی خطوط غالب صفحہ ۱۱۱

یہ شرف صرف دہلی اور لکھنؤ کے باشندوں کو حاصل ہے انہی کی تقلید پر زبان کی درستی منحصر ہے مولانا حالی نے اپنے دیوان کے مشہور مقدمہ میں ایک مستقل عنوان قایم کرکے اس کی اہمیت پر بحث کی ہے وہ کہتے ہیں:

زبان کو درستی کے ساتھ استعمال کرنا

اس باب میں سب سے زیادہ مفید اہل زبان کی صحبت اور اُن کی سوسائٹی میں اتنی مدت تک بسر کرنا ہے کہ اُن کے الفاظ محاورات بقدر معتدبہ بلا معلوم ہو جائیں پر زبان پر چڑھ جائیں لیکن چونکہ ایسا موقع ہر شخص کو بلا دشوار ہے اس لئے ضرور ہے کہ شعرائے اہل زبان کا کلام جسقدر زیادہ ممکن ہو غور اور توجہ سے بار بار دیکھا جائے نہ اس ارادے سے کہ خیالات اور مضامین میں اُن کی تقلید کی جائے بلکہ اس نظر سے کہ وہ الفاظ و محاورات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور خیالات کو کن اسلوبوں اور کن پیرایوں میں ادا کرتے ہیں۔[1]

مولانا حالی کے اس بیان سے اُس خیال کی ناپائیداری بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ محاورات اور روزمرہ کے متداول ہو جانے کے بعد تقلید کی ضرورت نہیں اول تو اُن محاورات کا استعمال ہی تقلید ہے دوسرے اسلوب بیان اور پیرایہ ادا ہمیشہ بدلتا رہتا ہے یہ بات اہل زبان کی تقلید سے کبھی بے نیاز نہیں کر سکتی۔

زبان کے لئے مرکز کی ضرورت پر ایک اور دلیل

اس بحث میں یہ نکتہ نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے کہ دہلی اور اُسکے اطراف میں جو بولی مروج تھی اس میں شہری طبیعتوں کی لطافت اور نفاست کے ہاتھوں سے غیر محسوس طریقہ پر تصرفات ہوتے ہوتے لفظیں اصل سے ہٹ گئیں، محاورے متغیر ہو گئے، اسلوب بدل گیا غیر زبان کی لفظیں اور ترکیبیں بکثرت داخل ہو گئیں یہاں تک کہ بات کرنے کا ڈھنگ بھی بدل گیا اس خبط کے اثر سے کچھ نئی لفظیں اور محاورے بھی پیدا ہو گئے اب ایک نئی زبان بن گئی یہی اُردو ہے، دیہاتوں میں زبان اپنی اصل پر بہت حد تک باقی رہ گئی اور شہروں کے باشندوں نے بھی دہلی کی شہری زبان کو معیاری سمجھ کے اُس کی تقلید کی یہاں تک کہ ہر شہر کی زبان اپنے دیہاتوں سے ممتاز ہو گئی، پھر بھی مقامی لفظیں اور محاورے بہت کچھ باقی رہ گئے اس وجہ سے زبان کھچڑی ہو گئی خالص نہ رہی اس کے معنے یہ ہوئے کہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کا نام اُردو ہے۔ دوسرے شہر کے باشندوں نے وہیں کی زبان کا چربہ اُتارا پھر بھی خالص نہ بن سکی اب اگر کسی لفظ کے صحیح و غلط محاورے کے معنی و محل استعمال میں امر دائر ہو گا تو فیصلہ انھیں کے کلام سے کیا جائے گا جن کی وہ زبان ہے۔

(باقی) سید محمد باقر شمس لکھنوی

نوٹ کر لیجئے

کہ پرانے پرچے پر ڈاکخانہ بجائے رعایتی محصول ایک پیسہ فی پرچہ کے پانچ گنا وصول کرتا ہے، اس لئے اگر دفتر میں پرچہ کی عدم وصولی کی اطلاع آخر ماہ تک نہ آئی تو ہم پرچہ بیرنگ بھیجنے پر مجبور ہوں گے اور آپ کو ۲، دیکر پرچہ وصول کرنا پڑے گا یا اگر اطلاع کے ساتھ پانچ پیسے کے ٹکٹ نہیں موصول ہوں گے تو تعمیل ہو سکے گی ورنہ نہیں۔ اور اس کے لئے دفتر مجبور ہے۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

محبت کی چند نفسیاتی گھڑیاں

(رومانچہ)

آج وہ جلد پہونچ گیا تھا، سورج دیوتا گنگا جی میں اشنان کرنے کی تیاری کر رہے تھے — پانچ فرلانگ لمبے پل پر اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ موٹر، تانگہ، یکہ اور پیدل چلنے والوں کی کثیر تعداد پل سے گزر رہی تھی۔ یہ رونق یا تو صبح کو ہوتی ہے یا پھر اس وقت شام کو۔ لوگ دن بھر کے تھکے اپنے اپنے کام سے لوٹ رہے تھے اور کچھ تفریح کے واسطے آرہے تھے۔ کاروباری دنیا کا شور و شغب سنتی ہوئی گنگا خاموشی کے ساتھ بہ رہی تھی کبھی کبھی اس کی کشادہ پیشانی پر شکن پڑ جاتی مگر پھر وہی سنجیدہ روش اختیار کر لیتی۔

رفیق اس ہنگامہ سے بے خبر ایک علیحدہ مقام پر کھڑا ہوا شہر سے پانی پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ سامنے فضا میں چڑیوں کی سیاہ لکیر سی اڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ لوگوں کی چیخ پکار کبھی کبھی رفیق کے کان میں آجاتی ورنہ وہ حتی الامکان اپنے کو اس پر شور ماحول سے غیر متعلق رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ..... "لاحول ولاقوۃ، دن بھر جھک مارنے کے بعد دو مچھلیاں نہیں، وہ بھی نوالہ بھر کی"

"ہاں بھئی، تمھیں تو مل گئیں — چلو ایک وقت کا شوربہ تو ہوا، مگر یہاں تو جیسے گئے تھے ویسے ہی کورے واپس آرہے ہیں"

کندھے پر بنسی رکھے، ہاتھ میں جھولا لٹکائے دو آدمی رفیق کے پاس سے یہ کہتے ہوئے گزر گئے — "ایک وقت کا شوربہ تو ہوا"

یہ آواز اس کے دماغ میں گونجتی رہی یہاں تک کہ وہ پھر اسی دنیا میں آگیا۔ اتنی جلد وہ اس "مادی حقیقت" کی طرف رجوع نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کے لطیف تخیلات کو صدمہ پہونچا، اس کی طبیعت کچھ پھیکی سی پڑ گئی۔ وہ حیات کی ان ناگزیر ضرورتوں کو محسوس غرور کرتا، مگر شاید کر جانا چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ اسوقت پریشان خاطر سا ہو گیا تھا، اس نے مڑ کر دیکھا۔ شکاری جا چکے تھے۔ سامنے سے تھکے ماندے مزدور قدم بڑھاتے ہوئے آرہے تھے۔ بعضوں کے ہاتھ میں ناشتہ دان تھے اور بعض خالی ہاتھ تھے۔ وہ اس دنیا سے اور قریب ہو گیا۔ ابا جی کی نظروں کے سامنے، ہرے بھرے درخت، شفق کی سرخی، دریا کے پاٹ کے پرانے اکہرے چہرے، دھنسی آنکھیں، تھکے قدم، ننگے بدن، کم کھانا، قہقہے اور خانگی باتیں تھیں۔ وہ اب بالکل ادھر متوجہ ہو چکا تھا، اس کی تفریح میں بدمزگی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا

"اب اسقدر جلد کبھی نہ آئیں گے، سارا مزہ خاک میں مل جاتا ہے"

رفتہ رفتہ سورج غروب ہو گیا، آمد و رفت بھی کم ہو گئی، کہیں کہیں لوگ نظر آجاتے، ورنہ پل خالی ہو چکا تھا، اندھیرا ہو چکا تھا، دور آبادی میں روشنی جھلملا رہی تھی، اپریل کی ۶ تاریخ تھی — چاند دریا کی سطح پر اپنی باریک نظریں جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رفیق اب پھر سکون محسوس کرنے لگا۔ اس کے ذہن سے تلخی زائل ہو چکی تھی۔ منظر کے تغیر کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت میں بھی تغیر پیدا ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ منظر سے تقریباً ہم آہنگ ہو گیا۔ اب وہ آزادی کے ساتھ جہاں چاہتا ٹہلنے لگتا۔ جہاں چاہتا کھڑا ہو جاتا وہ سینہ چلا چلا کر صاف اور ٹھنڈی ہوا کو پھیپھڑوں میں داخل کر رہا تھا، آدھ گھنٹہ کے بعد وہ گھر لوٹا — راستہ میں، پھر شکاری، مزدور

موٹر، یکہ، تانگا اسکے دماغ میں پھرنے لگے، مگر گھر پہونچتے پہونچتے وہ سیر و تفریح اور دلکش مناظر کو بالکل بھول چکا تھا۔

رفیق یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا، دن بھر کی بیکاری کے بعد — وہ تعلیم کو بیکاری کے مشغلہ ہی کے نام سے منسوب کرتا — ادب سے اس نے اتنا ہی سیکھا تھا — متوسط طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے مشکل ہی سے تعلیم کا کوئی دوسرا پہلو اس کی نظر میں آسکتا تھا نوکری یقینی نہیں تھی اس لئے کہ اس کے گھرانے میں کوئی بڑے عہدہ پر نہیں تھا نیچے طبقہ میں سے تھا نہیں کہ تعلیم کے نقصانات سمجھ سکتا اور گھر کے کاروبار ہی میں مصروف ہو جاتا۔ لہذا ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ جو وہ نکال سکتا تھا نکال رہا تھا۔ یعنی دن بھر پڑھنا، شام کو گشت کے لئے نکل جانا، رات کو تان کر سونا — شاعری سے کافی دلچسپی تھی، ناول خوب پڑھتا اور یونیورسٹی میں بھی اسی خیالی دنیا میں بسر کرتا — پروفیسر صاحب پڑھا رہے ہیں مگر اس کا ذہن ناول کے صفحات میں ہے۔ جو کچھ وہ لکھاتے رفیق لکھ لیتا، مگر سمجھ کر نہیں، بالکل یونہی تخیل پسند ہونے کی وجہ سے وہ کاہلی، ذہنی ہیجان اور خود فریبی میں لطف محسوس کرتا، مگر باوجود ان تمام دلچسپ مشاغل کے وہ زندگی میں ایک خلا سا محسوس کر رہا تھا — جس کو پُر کرنے کے لئے وہ روز گنگا کے پل پر چلا جاتا۔

دوسرے دن وہ پُل پر اسوقت پہونچا جب لوگ جا چکے تھے اور دن بھر کا شور دریا میں ڈوب چکا تھا۔ ملاح اپنی کشتیوں کو کنارے لگا چکے تھے۔ گھاٹ پر کہیں کہیں آگ جل رہی تھی — شاید ملاح 'بھوری' لگا رہے تھے۔

چاند نکل آیا تھا آج کی تاریخ کا چاند زیادہ بڑا، زیادہ حسین تھا دور تک روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ تارے بھی جا بجا نظر آرہے تھے، جنھیں کبھی کبھی کوئی شوخ لہر تھوڑی دور تک بہا لیجاتی اور چھوڑ دیتی گنگا اپنی قدیم روایات کو سمیٹے دنیا کے نشیب و فراز پر غور کرتی بہہ رہی تھی۔ پُل کے کھمبوں سے ٹکرا کر پانی عجیب موسیقی پیدا کر رہا تھا جس میں بیک وقت لطف و خوف دونوں شامل تھے۔ رفیق آج کل سے زیادہ سکون محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے کو ان 'ذی حیات' مناظر میں کھو دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ دن بھر کی تلخیوں کو پیچھے چھوڑ کر وہ قدرت کے گہوارہ میں سو جانا چاہتا تھا — وہ سوچ رہا تھا "گنگا کی ہلکی ہلکی تھپکیاں کس قدر خواب آور ہیں" مگر فوراً ہی سہم جاتا — گنگا کی ہلکی ہلکی تھپکیاں! پھر وہ اپنے کو نرم اور خنک ہوا کے آنچل میں چھپا لیتا یہاں البتہ اسے آرام ملتا۔ مقام کی 'شعریت' اسے شاعر ہونے پر مجبور کر رہی تھی، حالانکہ شعر سے سوائے لطف اندوز ہونے کے، اس نے آج تک ایک مصرعہ بھی موزوں نہیں کیا تھا — وہ اس تکلیف دہ احساس کے ساتھ اس روشن رات میں کھو گیا — ایک جگہ کھڑے کھڑے جب وہ تھک جاتا اور اسکی یکسوئی میں فرق آنے لگتا تو وہ ٹہلنے لگتا۔ ٹہلتے ٹہلتے اسکی زبان پر ایک نہل مصرعہ خود بخود جاری ہو گیا — "آہ! زمانِ حیات۔ آہ! زمانِ حیات" — مگر اسکے معنی وہ ایک غیر محسوس طریقہ پر اندر ہی اندر سمجھ رہا تھا — "آہ! زمانِ حیات!" ..... "آہ! زمانِ حیات!"

اس کا ہاتھ قمیض کے بٹن کو گھما رہا تھا۔ قدم تیز تیز پڑ رہے تھے۔ نظریں مناظر سے ہٹ کر پُل کے تختہ پر جم گئیں تھیں۔ مصرعہ کی بار بار تکرار اس کے دل کے ایک نامعلوم تار کو چھیڑ دیتی جس سے ایک مبہم اور غمگین نغمہ نکل کر اس کے ذہن میں گونجنے لگتا۔ آخر کار وہ تھک کر چھڑی سے ٹک کر کھڑا ہو گیا ——— وہ اسوقت بالکل مست تھا۔ یک بیک اس نے ایک آواز سنی جیسے کوئی چیز لہروں کو چیرتی ہوئی آرہی ہو اُس نے دیکھا تھوڑی دور پر ایک کشتی ہولے ہولے بہہ رہی تھی۔ وہ صاف طور پر نہ دیکھ سکا کہ اس پر کون کون ہیں۔ کچھ دیر وہ انتظار کرتا رہا کہ کشتی لوٹے گی مگر وہ ایک موڑ پر جا کر نظروں سے غائب ہو گئی۔ اب اس کی تمام تر توجہ کشتی کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔ مگر جلد ہی "کوئی ملاح ہوگا" کہکر اس نے اپنے دل کو مطمئن کر لیا — کچھ دیر ٹھہر کر وہ گھر چلا آیا۔

سات دن سے وہ برابر جاتا اور برابر کشتی کو دیکھتا۔ اُس کی بیچینی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اتنا تو یقینی تھا کہ کوئی صاحب دل

ٹہلنے نکلتا مگر اس کشتی پر اور کون کون ہیں؟ — یہی خیال اسے رہ رہ کر اس بات پر اکساتا کہ جا کر قریب سے دیکھ آئے لیکن اس کو وہ کچھ اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور اس 'راز' سے واقف ہو جائے گا۔ اس کے دماغ میں ایک خیال پرورش پا رہا تھا۔ نہایت ہی لطیف — نہایت ہی شاعرانہ مگر اس کو ابھی وہ خود 'اپنے' پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا دل عجیب اختلاجی کیفیت محسوس کرنے لگتا جب کبھی وہ اس خیال کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا — آج بھی وہ حسب معمول پُل پر کھڑا ہوا تھا۔ گنگا جی خوش خوش بہ رہی تھیں۔ پانی میں ڈوبی ہوئی ہوا دل و دماغ کو تازہ کر رہی تھی۔ چودھویں رات کا چاند صاف آسمان پر چمک رہا تھا — دور تک روپہلا دریا آسمان کے حسین راز، زمین کے سینہ پر بکھیر رہا تھا، کنارہ کے سیاہ درخت اس سیم گوں فضا کو غم آلود مگر لطیف کیفیت سے معمور کر رہے تھے۔ لہریں جھلملا رہی تھیں۔ چاروں طرف سکوت اور چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری دُنیا جنت کا ایک خواب دیکھ رہی ہے جس کا سلسلہ کبھی نہ ختم ہوگا۔ رفیق بیخودی کے عالم میں کہیں اور سانس لے رہا تھا — وہاں جہاں دل دھڑکنے کی آواز بھی نہیں سنائی دیتی۔ اس کی آنکھیں دُور کسی چیز کو ڈھونڈھ رہی تھیں کہ ناگاہ وہی کشتی ایک سمت سے اس طرف آتی دکھائی پڑی۔ رفیق نے اپنی نظریں اس پر جما دیں۔ رومان پسند دماغ میں ایک عورت نے جنم لیا — جو گنگا کی لہروں اور چاندنی رات کے سناٹے سے ملکر بنی تھی۔ اس نے کشتی کو غور سے دیکھا "بیشک ایک عورت ہے" اس کے کانوں نے ایک کھنکتے ہوئے قہقہے کی آواز بھی سنی۔ اسکے تصور میں ساری فضا نغمہ زار بن گئی....

کشتی قریب آ رہی تھی، اس کا دل دھڑک رہا تھا ..... "اچھا! رہنے دو۔ اُدھر ہی واپس لے چلو، کل اِدھر آئیں گے"۔ مردانہ آواز آئی، یہ آواز البتہ اسے صاف سنائی دی۔ اِسے بلاشک و شبہ وہ مردانہ آواز کہہ سکتا تھا۔ کشتی واپس جا رہی تھی، اس کا دل کچھ افسردہ سا ہو گیا۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور اس نے چاندنی میں آنچل کی خفیف سی سرسراہٹ بھی سنی — یہ اس کا گمان ہو سکتا ہے — مگر نہیں اس نے آنچل کو چمکتے بھی دیکھا جس کے دامن میں زریں تارے جھلملا رہے تھے۔ اس نے ایک بیک خوشبو بھی محسوس کی — وہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ "کہیں یہ سب خود اسی کا تصور نہ ہو" ..... دوسرے دن وہ خلاف معمول بہت جلد پہونچ گیا تھا حقیقت کی دنیا معہ اپنی سوگواریوں اور ناداریوں کے گزر رہی تھی۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا کہ ان پُر فضا مقامات کو بھی یہ لوگ اپنی ذہنی پستیوں سے مسموم کر دیتے ہیں"۔ وہ بیچینی کے ساتھ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ خدا خدا کر کے سورج ڈوبا اور پھر وہی سہانا منظر جیتا جاگتا نظروں کے سامنے نمودار ہو گیا۔ رفیق آج مناظر سے لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا۔ اُسے تو کشتی کا انتظار تھا — جو افق سے چاندنی اور گنگا کی لہروں پر بہتی ہوئی، ہلکورے کھاتی ہوئی، خفتہ جذبات کو بیدار کرتی ہوئی اسکی طرف آہستہ آہستہ آئے گی اور پھر وہ اُس میں وہ سب کچھ دیکھے گا جن کو ابھی تک کتابوں میں پڑھا کرتا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر چاروں طرف نظر دوڑا رہا تھا۔ "انتظار کی گھڑیاں بھی کس قدر پر لطف ہوتی ہیں" اس نے شاعرانہ انداز میں سوچنے کی کوشش کی۔ ایک گھنٹہ ہو گیا مگر کشتی نہ آئی۔ دو گھنٹے گزر گئے مگر گنگا کا دامن خالی رہا۔ وہ انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ مگر کچھ نہ دکھائی دیا — وہی گنگا کی خاموش لہریں، وہی چاند کی پھیکی کرنیں، وہی بے حس سیاہ درخت، لمحہ بہ لمحہ اسکا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف پھر دیکھا۔ مگر کچھ نظر نہ آیا۔ آخر کار مایوس ہو کر وہ گھر کی طرف چل دیا۔ جہاں تک دریا نظر آتا گیا وہ مڑ مڑ کر دیکھتا گیا۔ کشتی کا کہیں پتہ نہیں تھا — وہ راستہ بھر عجیب و غریب باتیں سوچتا گیا۔ "کیسی کشتی تھی؟ — کون ہو سکتا ہے اُس پر محض مرد ہوں گے؟" مگر اسکو ماننے پر اس کا دل تیار نہیں ہو رہا تھا ..... "چاندنی راتوں کی سیر کیا معنی؟ آج کیوں نہیں آئی!" ایک غمگین سا خیال اس کے دل میں دوڑ گیا وہ آہستہ آہستہ چل کر گھر پہونچ گیا۔ اُسے آج عجیب قسم کی کمی سی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چیز پُل پر بھول آیا۔

کہیں دو بجے رات کو بمشکل اسے نیند آئی۔

مجتبیٰ حسن (بی۔ اے)

جرمنی کی چھتری والی فوج

جرمنی میں چھتریوں والی فوج دو قسم کی ہے اور ہر ایک کا انتظام بھی علٰحدہ ہے اور اس کے فرائض بھی جداگانہ ہیں۔ ایک کا نام "ہوائی پیادہ فوج" ہے اور دوسری کا "ہوائی بندوقچی"۔

ہوائی پیادہ فوج کے دستے میں ۲۵ سے ۲۶ تک سپاہی ہوتے ہیں اور یہ بڑے بڑے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ان مقامات پر پہونچائے جاتے ہیں، جہاں انکو چھتریوں کے ذریعہ سے اُتر کر پیدل فوج کی سی خدمت انجام دینا ہیں۔ دشمن کے ہوائی اڈوں پر قبضہ کرنا عارضی پُل طیار کرنا اور دشمن کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں پر حملہ کرنا ان کا کام ہے تاکہ باقاعدہ پیادہ فوج کے حملہ کے لئے پہلے سے آسانیاں پیدا کر رکھیں۔

ہوائی بندوقچیوں کی تعلیم وہاں بالکل ایک تنہا شکاری کی سی ہوتی ہے وہ کبھی ہوائی پیدل فوج کے ساتھ بھی کام کرتا ہے اور کبھی اسکے لئے ہراول کی خدمت بھی انجام دیتا ہے۔ اس کا خاص فرض یہ ہے کہ وہ دشمن کے پلوں کو برباد کرے، تار اور ٹیلی فون کے سلسلہ کو کاٹے اور ایسے میدانوں پر پہلے سے قبضہ کرے، جہاں ہوائی پیدل فوج کو اُترنا ہے۔

اس قسم کے حملہ کی ابتدا سب سے پہلے روس نے کی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں جب سُرخ افواج کو حرکت میں لانے کی ضرورت ہوئی، تو ایک نوجوان روسی افسر نے دشمن کے عقب میں چند سپاہی چھتریوں کے ذریعہ سے اُتارے اور انھوں نے متعدد پُل توڑ کر دشمن کو سخت نقصان پہونچایا اسی کے ساتھ انھوں نے سویلین آبادی میں بھی خوف و ہراس پیدا کر دیا اور دشمن کی فوج کو بعض اہم مقامات سے پیچھے ہٹا دیا۔

اس تجربہ کی کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۸ء میں روس نے ایک پوری بٹالین چھتری بازوں کی طیار کر لی، اور آج روس کے پاس کئی ڈویژن ہوائی پیدل فوج کے پائے جاتے ہیں۔

فرانس کے ماہرین نے وہاں کے جنرل اسٹاف کو بھی مشورہ دیا کہ اس قسم کی فوج طیار کرے اور وہاں اسکے تجربے بھی کئے گئے، لیکن وار کونسل نے اس کو کچھ مفید نہ سمجھا اور اس خیال کو ترک کر دیا۔ لیکن جرمنی نے البتہ اس طرف خاص توجہ کی اور اسپین کی سول وار میں اس کا تجربہ بہت مفید ثابت ہوا، اس کے بعد پولینڈ پر حملہ کرنے کے وقت ان چھتری والے دستوں سے اور زیادہ کام لیا گیا۔ لیکن زیادہ وسیع پیمانہ پر ان سے ہالینڈ میں کام لیا گیا اور سچ پوچھئے تو وہاں کا قبضہ انھیں کی وجہ سے ہوا۔

اس فوج کی تربیت بڑے اہتمام سے ہوتی ہے اور والنٹیروں کی جماعت سے انکا انتخاب بڑی چھان بین کے بعد کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو ان کا جسمانی و نفسیاتی امتحان لیا جاتا ہے۔ ماہرین ان کے دل و اعصاب کی جانچ کرتے ہیں اور ایک کمرہ کے اندر جہاں ہوا کا دباؤ بہت کافی ہوتا ہے ان کو بند کر دیا جاتا ہے تاکہ اُن کے سانس کی نالیوں کی جانچ ہو سکے۔ ان تمام امتحانات کے لئے بہت سے آلات استعمال کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ صحت جسمانی کے اس کی قوت ارادی اور صبر و تحمل کا کیا حال ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا

ہے کہ اس میں لچک اور جلد فیصلہ کرنے کی اہلیت بھی پائی جاتی ہے یا نہیں - جب کوئی شخص ان امتحانات میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو پھر اس کی باقاعدہ فوجی تعلیم شروع ہوتی ہے -

چھتری بازی کی تعلیم اس طرح شروع ہوتی ہے کہ پہلے وہ ہوائی جہاز پر بیٹھکر چکر کھانے، غوطہ لگانے اور اُلٹنے پلٹنے کی مشق کرتا ہے اور یہ مشق اتنی زیادہ کرائی جاتی ہے کہ اس کے جسم میں ہر زاویہ سے لچکنے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے -

کودنے کی مشق میز سے کرائی جاتی ہے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ ۲۵۰ فٹ بلند منارہ سے چھتری لیکر اُترنے لگتا ہے - اسی کے ساتھ غیر زبانوں کی بھی تعلیم دیجاتی ہے اور اُڑتے اُڑتے جغرافیہ کا مطالعہ کرنا اور نقشے طیار کرنا بھی سکھایا جاتا ہے - چار ہفتے کی نہایت سخت مشق و تعلیم کے بعد وہ باقاعدہ چھتری باز فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے اور تیز و سست پرواز کی حالت میں ... ۴ فٹ کی بلندی سے اُترنے کا امتحان لیا جاتا ہے - اس کے بعد جوں جوں اس کی مشق بڑھتی ہے اس کا سامان بھی بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک مشاق چھتری باز جب اُترتا ہے تو اس کے پاس ایک مشین گن، ایک پھاوڑا، ایک سائکل، نقب لگانے کے آلات اور کھانے پینے کا سامان بھی ہوتا ہے -

جرمنی کے چھتری بازوں کی چھتریاں بہترین جاپانی ریشم کی ہوتی ہیں اور ایک چھتری ۲۵۰ پونڈ میں طیار ہوتی ہے - جرمنی میں دو قسم کی چھتریاں استعمال کی جاتی ہیں ایک وہ جو اُترتے وقت از خود کھُل جاتی ہیں اور دوسری وہ جنھیں ہوا باز از خود اپنے اختیار سے کھولتا ہے -

جب چھتری باز دستہ لڑائی کے لئے بھیجا جاتا ہے تو سب سے پہلے کمانڈر کودتا ہے اور وہ ایک نہایت تیز رنگ کی ریشمی چھتری استعمال کرتا ہے تاکہ دوسرے چھتری باز دور سے دیکھکر یہ معلوم کرلیں کہ وہ کہاں اُترتا ہے -

یہ لوگ عام طور پر چھتریاں اسوقت کھولتے ہیں جب زمین کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ ۳۵۰ فٹ ہوتا ہے - چھتریاں تین سکنڈ کے اندر کھل جاتی ہیں اور ساڑھے سولہ فٹ فی سکنڈ کے حساب سے نیچے اُترتی ہیں -

ایک بار جانچ کے وقت دیکھا گیا کہ ایک جرمن سپاہی ۲۴ ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے اُترا، اس کے پاس متعدد آلات تھے جنکے ذریعہ سے ہوا کا دباؤ، نیچے اُترنے کی رفتار اور ہوا کا رُخ معلوم ہو سکتا تھا اس کو ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو وہ بہت دیر میں چھتری کھولے اور اُترتے وقت وہ تمام آلات کو دیکھ کر نوٹ کرتا رہے کہ اُن سے کیا کیا باتیں دریافت ہوئیں -

اس نے اپنی چھتری اسوقت کھولی جب زمین کا فاصلہ صرف ۱۲۰ فٹ رہگیا تھا، اور اس دوران میں اس نے تمام آلات سے کام لیا - وہ نہایت محفوظ طریقہ سے نیچے اُترا اور کوئی حادثہ پیش نہیں آیا -

جرمنی کی چھتری والی فوج نے اس وقت تک خاصی کامیابی حاصل کی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ اس سے کہاں کہاں کام لیا جائے گا -

---

آپ کا نمبر خریداری

ہر مہینے پتہ کے کاغذ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے، اسے ایکبار اپنے کاغذات میں کسی جگہ نوٹ کر لیجئے - ہم برابر لکھتے رہتے ہیں کہ خط و کتابت میں خریداری نمبر ضرور لکھئے، لیکن آپ میں سے بہت کم اس پر توجہ فرماتے ہیں، آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کی یہ بے پروائی دفتر کے لئے کتنی تکلیف دہ ہے - بہرحال اگر آئندہ آپ نے اپنا نمبر خریداری تحریر نہ فرمایا تو عدم تعمیل کی ذمہ داری ہمارے سر نہ ہوگی -

منیجر نگار

مکتوبات نیاز

حضرت سلامت !

آپ نے میرا حال پوچھکر واقعی مجھے اچھا کردیا۔ مسیحا کا ذکر کتابوں میں سنا کرتے تھے، اب خود آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دُنیا کا تعلق آپ سے جو کچھ ہو، لیکن میں تو ساری دُنیا کھو دینے کے بعد بھی آپ کو حاصل کرنے کا سودا کرسکتا ہوں بشرطیکہ آپ اس پر راضی ہوں۔

ہرچند میری ارادت و عقیدت آپ کے ساتھ بالکل غیر مشروط حیثیت رکھتی ہے، تاہم فطرت انسانی قدم کے ساتھ نقش قدم کو بھی دیکھتی ہے اور دُنیا میں ہر محبت کرنے والے کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ محبت کا جواب محبت سے دیا جائے!

اک زمانہ ہوا جب میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ کو ہو یا نہ ہو، لیکن مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ اور پاؤں توڑکر بیٹھ جانے کے لئے غریب خانہ حاضر ہے، لیکن اس دعوتِ زاویہ نشینی کا جواب یہ ملا کہ آپ خود دُنیا میں گم ہوگئے اور میں، آپ کو ڈھونڈھتا کا ڈھونڈھتا رہ گیا۔ پھر

اے جفا ہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں !

میں آپ سے اس کی شکایت تو نہیں کرتا، لیکن اس تمنا کو اپنے دل سے نکالدوں، یہ بھی میرے امکان میں نہیں !

میں واقعی اس دوران میں بہت مضمحل رہا، لیکن حیران ہوں کہ آپ کو اس کی اطلاع کیونکر ہوئی! غالباً بربنائے کشف!

اچھا تو فرمائیے کیا ارادہ ہے۔ میں تو آپ کو بلاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ پھر نہ غائب ہوجائیں۔ آپ ہی فرمائیے کہ میں کب حاضر ہوں۔ آپ حسب معمول اس کا جواب شاید یہی دیں گے کہ "ابھی نہیں" لیکن میں زیادہ خوش ہوں گا اگر آپ کہدیں "کبھی نہیں"۔ کسی طرح یہ "ردوقبول" کا جھگڑا تو ختم ہو !

ماشاءاللہ ! کیا کہنا۔ حقیقت یہ ہے کہ تم جانتے ہو دُنیا میں کس طرح جینا چاہئے، یہ فن تم نے کہاں سیکھا، کس سے سیکھا۔ حیران ہوں ! —— لیکن افسوس ہے کہ تم اس کی داد ایک غلط شخص سے چاہتے ہو۔ ہرچند جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ میں بھی نیرو بن جاؤں اور جس وقت ساری دنیا میں آگ لگی ہو، میں رنگ رلیوں میں مصروف رہوں۔ لیکن انسانیت کا یہ بلند مرتبہ مشکل ہی سے کسی کو حاصل ہوسکتا ہے —— دُنیا میں پیغمبر تو کافی پیدا ہوئے، لیکن چنگیز بہت کم —— پھر یہ اس وجہ سے نہیں کہ قدرت نے دُنیا پر رحم کھایا بلکہ شاید اس لئے کہ بگاڑ کر بنانا اس کے لئے بھی آسان نہیں۔ فرعون نے جس قوم کو ایک دن کے اندر اپنے ملک سے نکال باہر کیا تھا، موسیٰ چالیس سال کی

سرگردانی کے بعد بھی کوئی گھر نہ اس کے لئے بنا سکے!

تمھاری کامیابی پر مجھے خوش ہونا چاہیئے، لیکن اسی کے ساتھ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ کامیابی تم کو کتنی مہنگی پڑی ہے تو زیادہ خوشی نہیں ہوتی — خدا کرے، یہ سب دیر پا ثابت ہو اور تم کو پھر اخلاق کا خون کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

ہاں، ہاں۔ خوب جانتا ہوں اور بہت ڈرتا ہوں — تم نے دیکھا ہوگا بعض لبوں کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں اور ہر وقت مسکراتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن شاید تم یہ نہ جانتے ہوگے کہ یہ تبسم ایک قسم کا "زہر خند" ہے اور میں ایسے لوگوں سے بہت خایف رہتا ہوں۔

تم نے جن کا ذکر کیا ہے ان میں یہ کیفیت بہت زیادہ نمایاں ہے اس لئے میں اُن سے بہت زیادہ ڈرتا ہوں — یہ درست ہے کہ بعض اوقات انسان خراب چیزوں کی طرف بھی مایل ہوجاتا ہے محض اس لئے کہ وہ حسین ہیں، لیکن یہ قدرت کا قانون نہیں بلکہ ہمارے جذبات کی اثر پزیری ہے۔ اس کی عمر بھی کم اور نتیجہ بھی خطرناک!

بہرحال وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہوچکا۔ میں اسی کو غنیمت سمجھوں گا اگر تلخیاں جلد نہ شروع ہوں۔ مجھ سے داد نہ چاہو، کیوں اپنے لطف کو غارت کروگے۔

قبلہ، آپ نے بالکل درست فرمایا کہ انھوں نے میرے متعلق آپ سے جو کچھ کہا وہ کم از کم آپ کے لئے ضرور اطمینان بخش ہے۔ لیکن آپ اس بارہ میں مجھ سے کچھ نہ پوچھئے۔ دُنیا میں دو قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں ایک وہ جو کہتے اچھا ہیں اور دوسرے وہ جو سنتے اچھا ہیں، میں ان دونوں میں سے کوئی نہیں ہوں اور وہ صاحب ان دونوں کے ماہر ہیں۔

جواب تو خیر بڑی بات ہے، مجھ سے تو "ہاں ہاں" بھی مشکل سے کہا جاتا ہے۔ وہ کہلیں جو جی میں آئے اور آپ سمجھ لیں جو آپ کی سمجھ میں آئے، میری طرف سے سوائے خاموشی کے آپ اور کچھ نہ سنیں گے۔ یہ "عافیت طلبی" نہیں بلکہ میری نااہلی ہے۔ خدا کرے آپ اپنے یقین کی طرف سے شرمندہ نہ ہوں۔

لاحول ولا قوۃ! آپ نے بھی کس کا ذکر کیا۔ وہ جو پیدا ہوا ہے انسانوں میں لیکن زندگی بسر کرتا ہے حیوانوں کی سی! صرف "جسم ہی جسم" رکھنے والے انسان تو بہت ہیں، لیکن بغیر روح کے انسان کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک وہ بھی ہیں جن کے آپ اس قدر دلدادہ ہیں۔ مجھے اُن سے بہت کم واسطہ پڑا ہے، لیکن انھیں جانتا اچھی طرح ہوں۔

انسان کا انسان نہ ہونا اور اس کا دشمنِ انسانیت ہونا، ان میں بڑا فرق ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ آپ

اُسی کو انسان سمجھتے ہیں جو زندہ چیزوں کو کچلتا ہوا گزر جائے، جو پھولوں کو توڑتا اور مسلتا ہوا نکل جائے، جو خوب ہنسے لیکن صرف اُس وقت جب دوسرے مصائب میں مبتلا ہوں!

میرا یہ خط انھیں سنا دیجئے، لیکن جو کچھ وہ کہیں اس کو مجھ تک نہ پہونچائے۔

مکرمی - کیا عرض کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا - ایک رباعی یاد آگئی، سنئے:-

پرسید یکے منزل آں مہر گسل — گفتم کہ دلِ من ست اورا منزل
گفتا کہ دلت کجاست؟ گفتم بر او — پرسید کہ او کجاست؟ گفتم، در دل!

مطلب یہ کہ نہ دل کا صحیح ٹھکانا معلوم نہ اس مہر گسل کا۔

کچھ کہتا ہوں تو آپ کو تکلیف ہوتی ہے، نہ کہوں تو آپ خاموش نہیں رہنے دیتے، پھر نہ آپ کی تکلیف گوارا، نہ اپنی خاموشی پسندیدہ، حیران ہوں، کیا کروں، کیا نہ کروں!

میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مجھے ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور نہ کیجئے اور اب پھر وہی کہتا ہوں - لیکن اگر یہ اہتمام صرف اس لئے ہے کہ آخر میں الزام میرے ہی سر قایم رہے تو میں اس قربانی کے لئے طیار ہوں، لیکن جو کچھ کیجئے اس یقین و اعتراف کے ساتھ کیجئے کہ مجھے آپ سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔

دربار داری کا سلیقہ مجھے کبھی حاصل نہیں ہوا، اس لئے آپ کیوں بار بار اس بات کو چھیڑتے ہیں، جسکے متعلق میں اپنی رائے قطعی طور پر ایک بار ظاہر کر چکا ہوں - میں آپ کا سہی، لیکن میری رائے تو میری بھی پابند نہیں، کسی اور کا کیا ذکر ہے!

حضرت! گرامی نامہ پہونچا - یہ آپ نے کیا فرمایا - میں اور آپ کے عدم التفات کا گلہ مند!

زغارتِ چمنت بر بہار منت ہاست
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

اس سے زیادہ "سپردگی و فتادگی" اور کیا چاہئے!

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً وہ شکایت بھی کرتا اور آپ سے تلافی بھی چاہتا، لیکن میں کہ آپ کی "بیگانہ وشی" کو بھی محبت و خلوص سمجھتا ہوں اس جُرم کا مرتکب کبھی نہیں ہو سکتا!

چشمِ خطا نظارہ ندانم چہ دیدہ است!

بندہ نواز!

آپ وہاں جا تو رہے ہیں، لیکن کس اہتمام کے ساتھ؟ اس کی خبر نہیں - جسوقت یوسف مقر جا رہے تھے تو کیا وہ جانتے تھے کہ وہاں ایک زلیخا بھی ہے - ڈر رہا ہوں کہ مبادا آپ کے سفر کا بھی کچھ ایسا ہی انجام ہو۔

وہ تو خیر پیر تھے، کہ الزام عاید ہوا تو صفائی میں قمیص کا پچھلا دامن پھٹا ہوا دکھا دیا اور لوگوں نے اسے مان بھی لیا، لیکن آپ اپنی چاک دامانی کو کیونکر چھپائیں گے۔

اگر آپ کو اپنے صبر و ضبط کا امتحان لینا تھا، تو گھر بیٹھے بھی ہو سکتا تھا، وہاں جانا ضروری نہ تھا۔ بہر حال وہاں پہونچکر تو خیر کیا، لیکن وہاں سے واپس آنے کے بعد ضرور لکھئے گا کہ آپ کس عنوان سے پہونچے اور کس حال سے واپس آئے۔

جناب والا - مکرمت نامہ پہونچا۔ اگر آپ نے یہ نہ لکھا ہوتا کہ جواب کی ضرورت نہیں، تو شاید میں خاموش رہتا آپ کی تنبیہ کا شکریہ، لیکن اسی کے ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے، کہ جن کے "توبہ و استغفار" سے آپ اس قدر مرعوب ہیں، اُن کے "سجدۂ ریائی" کا راز دار مجھ سے زیادہ کوئی نہیں۔ آپ تو صرف نشانِ سجدہ دیکھتے ہیں اور میں ان کا دل دیکھتا ہوں جو اس سے زیادہ بڑے سیاہ داغ کا مالک ہے!

جی ہاں، میں نے ان کے سب سے بڑے دینی کارنامہ کو دیکھا ہے۔ آپ اسے تفسیر کہتے ہیں، میں اسے "تفضیح" کہتا ہوں۔ حیران ہوں کہ آپ کے ذوقِ سلیم کو کیا ہو گیا ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ اگر میں چار دن اس شخص کے پاس رہوں تو استسقاء ہو جائے، چہرہ کا تہیج تو دیکھئے گویا جلد کے نیچے کچھ لہو بھرا ہوا ہے اور بے رونقی کا تو خیر، کیا پوچھنا۔ معلوم ہوتا ہے کربلا میں خاک اُڑ رہی ہے۔

خدا کے لئے بتائیے، بعض دینداروں کی صورتیں کیوں مسخ ہو جاتی ہیں۔ آپ کہیں گے یہ "فرطِ انوار" ہے، میں کہوں گا خدائی پھٹکار ہے۔

آپ نے اگر اس طنطنہ کے ساتھ خط نہ لکھا تھا تو شاید میں بھی اتنی صاف گوئی سے کام نہ لیتا۔ بہر حال اب بھی وقت ہے کہ آپ اس ہیضہ کو واپس لے لیں ورنہ

تو دانی خرقۂ پشمینہ داری!

محترم - آپ نے بالکل درست فرمایا کہ زمانہ کا ساتھ نہ دیجئے تو وہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے، لیکن میں اس کا زیادہ موید نہیں، علاوہ اس کے سوال یہ بھی ہے کہ آپ "زمانہ" کسے کہتے ہیں۔ کیا زمانہ عزیز و اقارب کا نام ہے، محلہ والوں کا نام ہے، دوست احباب کو زمانہ کہتے ہیں، محلہ کے نمازیوں کا نام زمانہ ہے! مسجد کا موذن و امام زمانہ کہلاتا ہے۔

معاف فرمائیے، آپ نے زمانہ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ دنیا کے عام رجحان کا نام زمانہ ہے، اس رَو کا نام زمانہ ہے کہ اس کا ساتھ نہ دیجئے تو مصائب کا مقابلہ کیجئے۔ مثلاً ایک زمانہ تھا جب حکومت مذہب کی تھی اور عقل سے کام لینا گناہ سمجھا جاتا تھا۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ لوگوں نے عقل سے کام لیا اور مصائب جھیلے۔ اسی طرح اب زمانہ ہے،

سرمایہ داری کا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم اس کا ساتھ دیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم غلامی یا ذلت و افلاس کے اس قدر عادی ہو جائیں کہ ہمارے احساس کو کوئی تکلیف نہ ہو، لیکن جن میں غیرت و خودداری ہے وہ ہمیشہ اس کا مقابلہ کریں گے اور پامال ہوتے رہیں گے، یہاں تک کہ دُنیا میں سوشلزم کا زمانہ آجائے۔ میں نہیں کہتا کہ سوشلزم، انسانیت کا انتہائی مقصد ہے۔ لیکن مدعا تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ زمانہ کا مفہوم زیادہ وسیع قرار دیجئے اور اس کی مخالفت کو گناہ نہ سمجھئے۔

انسان ایک حال پر قایم نہیں رہ سکتا۔ اگر دُنیا فردوس ہو جائے تو بھی ایک نہ ایک دن وہ اسے جہنم میں ڈال کر باہر نکل آئے گا۔ انسان کے ابتدائی عہد کا حال تو معلوم ہے، لیکن اس کا مستقبل کیا ہوگا، کسی کو خبر نہیں بندگی کے دور سے گزر کر وہ خدائی کے مرتبہ تک تو فرعون ہی کے زمانہ میں آچکا تھا، لیکن اب وہ خدا بننا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے۔ اس سے پوچھئے کہ اس سے زیادہ ارتقاء اور کیا ہو سکتا ہے؟ وہ کہتا ہے یہ عہد تاریکی کی باتیں تھیں، یعنی جب انسان جاہل تھا تو خدا بنانے میں اپنا وقت ضایع کرتا رہا، لیکن اب عقل آئی ہے، اور وہ انسان بنانا چاہتا ہے۔ خدا کی تعمیر میں تو بڑی آسانی تھی کہ جو چیز سمجھ میں نہ آئی، اس کو خدا کہدیا، لیکن انسان تو وہی چیز بن سکتی ہے، جو سمجھ میں آجائے، پھر سمجھ جتنی زیادہ ہوتی جائے گی اتنا ہی بہتر انسان بنتا جائے گا، یہاں تک کہ خدا کا وجود جو اسوقت کائنات میں صرف بادل کے چھوٹے سے دھبہ کی طرح نظر آرہا ہے وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا اور انسانیت بالکل پہلی مرتبہ صحیح معنے میں آزادی کی سانس لے گی!

سنا آپ نے، یہ ہے آجکل کی رَو اور یہ ہے زمانہ کا رجحان! پھر کیا آپ اس کا ساتھ دینے کے لئے طیار ہیں؟ اس میں شک نہیں انسانیت سخت مصیبت میں مبتلا ہے، لیکن اسکا درد ابھی اس حد سے نہیں گزرا کہ دوا ہو جائے۔ فی الحال تو اُسے اسی طرح تڑپنا ہے اور ہم کو آپ کو بھی، کیونکہ شاید ہم لوگ اس مرتبہ کے نہیں کہ منبر سے دار تک پہونچنے کی جرأت کر سکیں۔

ملنے کا پتہ
دارالاشاعت پنجاب لاہور

ملنے کا پتہ
دارالاشاعت پنجاب لاہور

چوپال

یہ کتاب مشہور نوجوان شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے چودہ دیہاتی افسانوں کا مجموعہ ہے حقیقی ہندوستان دیہات میں ہے۔ اور دیہاتیوں کی زندگی کی طرف اب تک ہمارے ادیب اور شاعر پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے اس کتاب نے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے دیہات کے سادہ مناظر اور سادہ باشندوں کی جو تصویریں ندیم نے ان افسانوں میں پیش کی ہیں وہ اُردو ادب میں ایک دلخوشکن بیداری کا پیش خیمہ ہیں۔ صحیح مشاہدہ، صحیح احساس اور سلاستِ زبان ان کہانیوں کی جان ہیں۔ سادہ لوح دیہاتی لڑکوں اور لڑکیوں کی محبت دوستی اور دشمنی ان افسانوں کا موضوع خاص ہے اور انہیں پڑھکر انسان یوں محسوس کرتا ہے۔ جیسے ایک ایسی دُنیا میں تیرتا چلا جا رہا ہے جہاں پر تکلف تہذیب کی ہماہمی اور مشینوں بھرے شہروں کا غلغلہ نہیں بلکہ آسمانی سکوت اور فردوسی خاموشی ہے۔ اور اس سکوت میں غریبوں کی کراہیں اور بیواؤں کی آہیں سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہیں۔

ملک کے مشاہیر اور مقتدر اخبارات و رسائل نے اس کتاب پر حوصلہ افزا تبصرے کئے ہیں۔ قیمت عہ

چراغاں

(شمع سے لیکر بجلی تک)

تاریخی نقطۂ نظر سے

یہ زمانہ نور و حرارت کا دور کہا جاتا ہے۔ ایک طرف روشنی نے ساری دُنیا کو جگمگا رکھا ہے اور دوسری طرف حرارت نے مصنوعات کے ڈھیر لگا رکھے ہیں۔ لیکن شاید کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ عہدِ حاضر کی جگمگاتی ہوئی روشنیاں، رقص گاہوں کی خوبصورت نورپاشیاں، اور عکاس خانوں کی دلفریب ضوباریاں کہاں سے آئیں اور اس باب میں اولیت کا فخر کسے حاصل ہے؟

یہ تو اکثر حضرات کو معلوم ہے کہ علم الکیمیا، علم الطب، جبر و مقابلہ اور اسی طرح کے بہت سے علوم جن پر اہلِ مغرب کو ناز ہے، عربوں کی ملکیت تھے، لیکن شاید یہ معلوم نہ ہوگا کہ یوروپ نے چراغاں کا فن بھی عربوں ہی سے حاصل کیا۔

قدیم یونان میں، گھروں کے اندر روشنی کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ ستونوں پر مثلث شکل کے ظروف رکھکر ان کے اندر آگ جلا دیتے تھے یا لکڑی کی مشعل بنا کر اسے روشن کر دیتے تھے۔ لیکن اس سے دھواں بہت پھیلتا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب عربوں میں چراغ کا رواج عام ہو چکا تھا اس لئے جب اہل رومہ اور یونانیوں کے تعلقات عربوں کے ساتھ قایم ہوئے تو انھوں نے بھی عربوں کی تقلید میں چراغ جلانے شروع کئے۔ جس کا ثبوت ان کے آثار سے ملتا ہے۔

انھوں نے پہلے صرف مٹی اور معمولی دھاتوں کے چراغ بنائے اور پھر سونے چاندی کے چراغ بنا کر معبدوں کو بھی روشن کیا منروا کے بُت کے سامنے قلعۂ ایتھنس میں جو چراغ معلق رہتا تھا وہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں پورے سال کے لئے ایک ہی دفعہ تیل بھر دیا جاتا اور وہ رات دن روشن رہتا تھا۔

اس کے بعد صدیوں پر صدیاں گزرتی گئیں لیکن کوئی ترقی اس فن میں نہ ہوئی، یہاں تک کہ اٹھارویں صدی کے مغربی ملاح و کاشتکار بھی یونانیوں کی تقلید میں چراغ ہی جلاتے تھے اور شاید اُن سے زیادہ ادنےٰ قسم کے۔

چراغ کے بعد شمع آئی، لیکن اس کی ابتدا بھی عربوں نے کی تھی۔ عرب سے یہ فینیسا (وینس) میں آئی اور پھر آٹھویں صدی تک تمام یورپ میں پھیل گئی، لیکن اس کا استعمال صرف امراء کے یہاں ہوتا تھا یا خاص خاص تقریبوں میں۔ دیواروں پر، سڑکوں کے دونوں طرف، دروازوں اور کوٹھوں پر شمعدانوں میں شمعیں روشن کر دیجاتی تھیں اور اس طرح مسرت کا اظہار کیا جاتا تھا۔

اس کے بعد چودھویں صدی میں فانوس کا رواج شروع ہوا، اور یہ بھی وینس یا فینیسیا سے آیا (فانوس ماخوذ ہے فینیسا سے)

وینس والے مذہبی تقریبوں اور خوشی کے مواقع پر گھروں کے اندر اور کشتیوں پر سیر کے وقت فانوس ہی روشن کرتے تھے .....
..... یہ فانوس کاغذ کے نہ ہوتے تھے بلکہ مختلف رنگ کے باریک ریشمی کپڑوں سے طیار کئے جاتے تھے اور ان پر پھولوں اور چڑیوں کی تصویریں منقوش ہوتی تھیں۔ یہاں کے بعض ملاح چین گئے تھے، اور وہاں سے واپس آکر انھوں نے اس نقاشی کو رواج دیا۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں پیرس کے حکام تمام تقریبوں میں چراغاں کا خاص اہتمام کرتے تھے اور پبلک کو بھی حکم دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے گھروں کی دیواروں اور دروازوں پر چراغاں کریں لیکن اس پابندی کے ساتھ کہ دھواں اور آواز پیدا نہ ہو اس قسم کے چراغاں کا رواج انیسویں صدی کی ابتدا تک قایم رہا۔ لیکن اس کے بعد جب گیس ایجاد ہوئی تو ۱۸۲۲ء میں سب سے پہلی مرتبہ پیرس کے شاہی محل میں گیس روشن کی گئی اور پھر اس کا رواج عام ہوگیا۔

گیس کے بعد بجلی آئی اور اس نے رات کو دن بنا دیا۔ اس سلسلہ میں وولٹا کا بیٹری ایجاد کرنا اور ہمفری کا کہربائی شرارے پیدا کرنا، خاص ایجادیں تھیں جنھوں نے بجلی کی روشنی کو عام کرنے میں بڑی مدد پہونچائی۔

اب بجلی کے ذریعہ سے جس جس طرح روشنی کی جاتی ہے، اور جو جو جدتیں اس میں پیدا کی گئی ہیں اُن کے اظہار کی ضرورت نہیں لیکن سب سے زیادہ قوی مظاہرہ سرچ لائٹ (کشافہ) کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ رات کو دن سے زیادہ روشن بنا دیتی ہے۔

نمایشوں میں جس جس طریقے سے روشنیوں کی نمایش کی جاتی ہے، اُن میں ہندسی شکلیں بھی پیدا کی جاتی ہیں اور پانی کے فواروں کے ساتھ بجلی کی روشنی کا امتزاج تو حقیقتاً بالکل فردوسی چیز ہے۔

روشنی کا مستقبل ابھی اور بہت سے امکانات اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اب سے ایک صدی بعد کی روشنی کیا چیز ہوگی۔

مطبوعات طاق بستاں

بھیجے رب رکھنی صاحب — نگار بکڈپو لکھنؤ

بہترین انتقادی لٹریچر

خواب کی دنیا: - خواب کی دنیا کی وسعت سچ پوچھئے تو بیداری کی دنیا سے زیادہ ہے لیکن ہم کو اسوقت تک یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ اُسکی نوعیت کیا ہے حقیقت کا علم کجا؟ ہر زمانہ اور ہر ملک میں لوگوں نے کوشش کی کہ خواب کیوں نظر آتے ہیں، انکی علمی اور نفسیاتی یا روحانی توجیہہ کیا ہو سکتی ہے اور تعبیر کوئی معنی رکھتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ انھیں سوچنے والوں میں سے ایک شخص سگمنڈ فرویڈ بھی تھا اسنے اپنی ساری عمر اسی تحقیق میں بسر کردی اور آخر عمر میں ایک کتاب لکھکر خود بھی اسی خواب کی دنیا میں چلا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے جس میں مولانا عبدالمالک آردی نے فرویڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ (ع ر)

الہامات شاد: - شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن اگر آپ انکے کلام کا انتخاب معہ ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت علاوہ محصول ۸ ر

اقبال کی شاعری: - یہ کتاب بھی مولانا عبدالمالک کے زور قلم کا نتیجہ ہے اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اسکی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت علاوہ محصول ۱۰ ر

نیرنجات کا بادشاہ

ہوڈنی

(مسلسل)

پچھلے مہینے ہم نے بتایا تھا کہ ہوڈنی ایک مقفل بائیلر کے اندر سے باہر نکل آیا حالانکہ وہ بدستور مقفل تھا۔ اس میں وہ کیونکر کامیاب ہوا؟ اس کا تعلق بھی کسی روحانی طاقت سے نہیں بلکہ ہوشیاری و تدبیر سے تھا۔

یہ ہم لکھ چکے ہیں کہ ہوڈنی کے نقشہ کے مطابق ہی بائیلر طیار کیا گیا تھا اور تماشہ سے ۲۴ گھنٹے پہلے اس کے پاس بھیجدیا گیا تھا۔ بائیلر بنانے والے کو چونکہ اس کی مضبوطی پر یقین تھا اس لئے اس نے بائیلر، ہوڈنی کے پاس بھیجدیا تھا ہوڈنی نے یہ کیا کہ اندر کی دو سلاخوں کو جن کے ذریعہ سے بائیلر کا ڈھکنا بند ہوتا تھا بدلدیا، یعنی صورت تو اس نے وہی رکھی لیکن لوہا بہت نرم استعمال کیا۔

جب کمیٹی کے لوگوں نے تماشہ کے وقت بائیلر اور سلاخوں کو دیکھا تو بظاہر کوئی فرق نہ تھا، اسلئے انھیں یہ شک گزر ہی نہ سکتا تھا کہ سلاخیں بدلدی گئی ہیں۔ جب ہوڈنی بائیلر کے اندر بند ہوا تو اس نے ایک ریتی سے جو اس کے پاس چھپی ہوئی تھی ان سلاخوں کو ریتنا شروع کیا۔ ریتنے کی آواز پبلک تک اس لئے نہ پہونچ سکتی تھی کہ بینڈ پورے زور کے ساتھ بج رہا تھا۔ چونکہ لوہا بہت نرم تھا اس لئے آسانی سے کٹ گیا اور اس طرح ہوڈنی باہر نکل آیا، لیکن باہر آنے کے بعد اس نے پھر اصلی سلاخیں لگادیں اور ریتی ہوئی سلاخوں کو بانس کے خول کے اندر جن پر اس کا خیمہ تنا ہوا تھا چھپادیا۔

(۳) تیسرا واقعہ جس نے لوگوں کو بہت زیادہ حیرت میں ڈالدیا یہ تھا کہ وہ ایک کاغذ کے تھیلے سے باہر آگیا اور تھیلا بدستور جوں کا توں بند رہا۔

ایک تھیلا بڑے لفافہ کی شکل کا طیار کیا گیا جس کے اوپر کے حصہ میں گوند لگی ہوئی تھی اور وہ لفافہ پر چپکایا جاسکتا تھا چنانچہ جب ہوڈنی اس کاغذی تھیلے کے اندر داخل ہوا تو لفافہ چپکا دیا گیا اور جوڑ کی جگہ پر کمیٹی والوں نے دستخط کردئے۔ اس کے بعد اس کے چاروں طرف پردہ کھینچدیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ہوڈنی پردہ کھول کر باہر آگیا اسی حال میں کہ تھیلا اس کے ہاتھ میں اسی طرح بند تھا اور لوگوں کے دستخط موجود تھے۔

اس عمل کے لئے اسے زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑی۔ جب وہ تھیلے کے اندر بند ہوا تو اس نے استرے کا پھل لیکر چاروں طرف سے اسے کاٹ دیا اور باہر آکر اسے پھر گوند سے چپکا دیا۔ اس طرح یہ تو ضرور ہوا کہ لفافہ دو انچ چھوٹا ہوگیا، لیکن یہ

ایسی بات نہ تھی کہ لوگ اسے محسوس کرتے، کیونکہ لفافہ پہلے بھی ناپا نہ گیا تھا۔

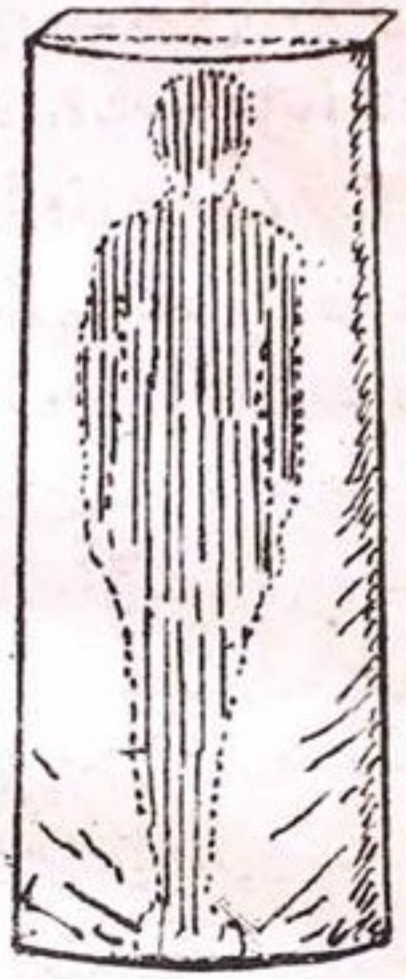

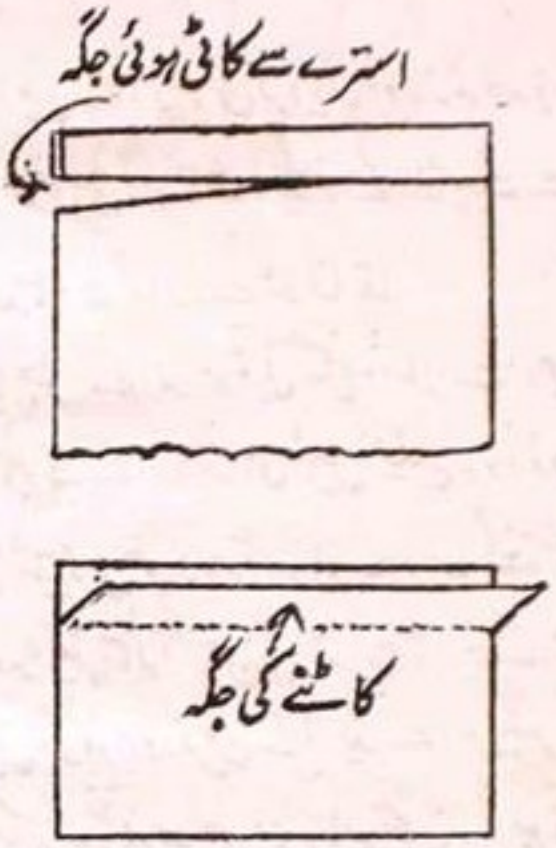

اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ تھا کہ وہ امریکہ میں ڈاک کے تھیلے سے باہر نکل آیا۔ اس واقعہ نے وہاں کے علمی حلقوں میں خلش پیدا کر دی اور بہت سے پروفیسروں نے اپنے اپنے گھروں پر ہر طرح کوشش کی کہ ڈاک کے تھیلے سے نکل آئیں لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ ہوڈنی اس میں کس طرح کامیاب ہوا، اس کے سمجھنے کے لئے پہلے تھیلے کی شکل ملاحظہ کیجئے:

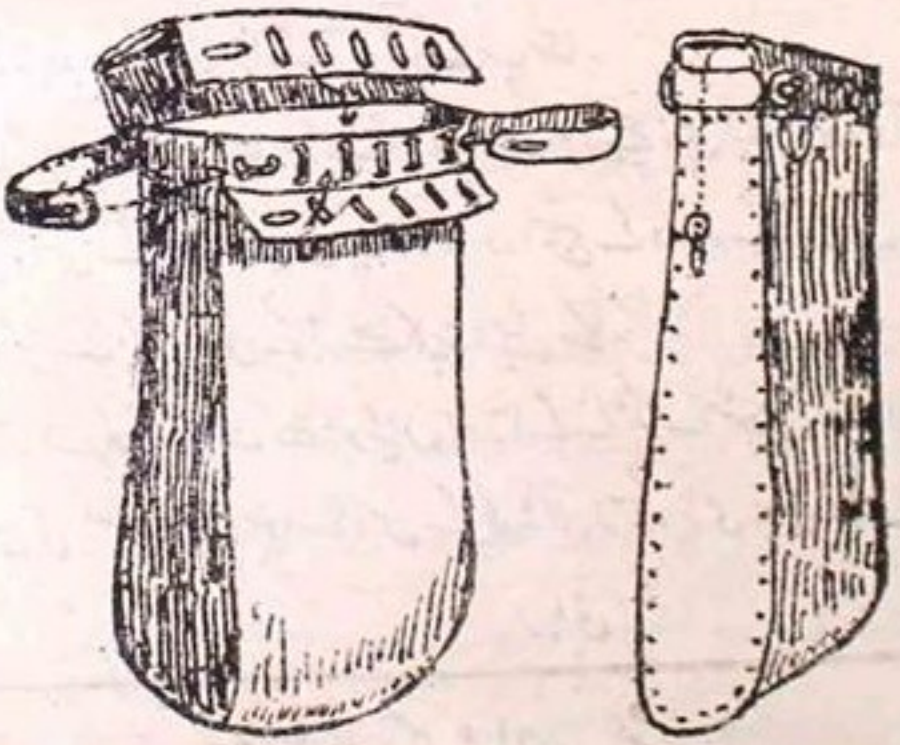

ڈاک کا تھیلہ بند ڈاک کا تھیلہ کھلا ہوا

ہوڈنی کو پہلے سے معلوم تھا کہ ڈاک کے تھیلوں میں کس قسم کے قفل استعمال ہوتے ہیں اور ایک کنجی وہ اسکی حاصل کر چکا تھا۔ جسوقت وہ تھیلے میں بند ہوا تو کنجی اس کے پاس چھپی ہوئی تھی۔ اس نے ڈھکنے کے نیچے سے کنجی کو باہر نکالا اور قفل کھول لیا۔ کنجی کا قفل تک

پہونچنا اور اس کو گھمانا بیشک مشکل کا کام تھا، لیکن ہوڈنی ان ترکیبوں کا ماہر تھا اور چونکہ تھیلا کرمچ کا تھا اس لئے کھینچ کھانچ کر اس نے کنجی کو قفل تک پہونچا ہی دیا اور جب باہر نکل آیا تو پھر قفل لگا دیا۔

(۵) ہوڈنی کا سب سے بڑا کارنامہ وہ سمجھا جاتا تھا جب وہ زمین کے اندر دفن کر دیا گیا اور زندہ رہا۔ زمین میں ایک گڑھا چھ فٹ گہرا کھودا گیا اور ہوڈنی کا تابوت اس کے اندر اُتار کر مٹی ڈال دی گئی۔ یہ تماشہ دیکھنے کے لئے بہت سے لوگ ہر طبقہ کے موجود تھے اور بے چینی سے گھڑی دیکھ رہے تھے، کیونکہ ۵۰ منٹ کے بعد تابوت کو اندر سے نکالنا تھا۔

جب مقررہ وقت ختم ہوا تو گڑھا کھود کر تابوت باہر نکالا گیا جس کے اندر ہوڈنی صحیح و سلامت موجود تھا۔ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ وہ اپنے ساتھ آکسیجن گیس لے گیا تھا، بعض نے یہ کہا کہ وہ تابوت کے اندر تھا ہی نہیں، لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ہوڈنی نے سانس بڑھانے کی اتنی مشق کر لی تھی کہ وہ آسانی سے ایک گھنٹے تک ایک جگہ بند رہ سکتا تھا ہوڈنی نے تابوت میں بند ہو کر، بہت چھوٹی چھوٹی سانسیں لینا شروع کیں تاکہ آکسیجن کی مقدار جو تابوت کے اندر موجود ہے جلد ختم نہ ہو جائے

(۶) ایک مرتبہ ہاتھوں میں ہتکڑی ڈال کر وہ لکڑی کے بکس میں بند ہوا اور کرین کے ذریعہ سے اس بکس کو پانی کے اندر ڈالدیا گیا بکس کے پیندے میں سوراخ بھی کر دیا گیا تاکہ پانی اندر بھر جائے، لیکن ہوڈنی پھر بھی زندہ باہر نکل آیا۔ ہوڈنی کے اس عمل پر لوگوں کو سخت حیرت ہوئی۔ لیکن اس کی کامیابی کا راز صرف یہ تھا کہ ہتکڑی خود اسی کی بنائی ہوئی تھی جو ایک کمانی دبانے سے از خود کھل جاتی تھی اور اُس کے پاس کیل کاٹنے کا اوزار چھپا ہوا تھا۔ جب بکس پانی کے اندر ڈالا گیا تو اس نے فوراً ہتکڑی کھولی اور پھر اندر ہی اندر اُس اوزار سے کیلیں کاٹیں اور بیچ کا تختہ اُبھار کر باہر نکل آیا اور تختہ کو پھر اس کی جگہ پر رکھکر دبا دیا۔ ہوڈنی چونکہ تیرنے میں بھی بڑا مشاق تھا اس لئے وہ یہ تمام کام اندر ہی اندر آسانی سے کر سکا۔

(۷) ایکبار ہوڈنی نے یہ تماشہ دکھایا کہ وہ ایک سپید لباس میں ایک گھوڑے پر سوار اسٹیج پر آیا۔ اسکے ساتھیوں نے ایک بڑے پنکھے سے اس کی آڑ کر دی لیکن چند سکنڈ کے بعد جب پنکھا ہٹایا گیا تو ہوڈنی غائب تھا۔

اس کا راز صرف یہ تھا کہ ہوڈنی کا سپید لباس کاغذ کا بنا ہوا تھا اور نیچے وہی لباس تھا جو اسٹیج پر دوسرے کام کرنے والوں کا تھا۔ جب پنکھے کی آڑ کی گئی تو اس نے کاغذ کا لباس پھاڑ ڈالا اور اسٹیج کے دوسرے آدمیوں کے گروہ میں ملگیا۔ چونکہ یہ آدمی متعدد تھے اور ان کا شمار کیا نہ گیا تھا اس لئے ایک آدمی کے بڑھنے کا پتہ نہ چل سکا۔

ایک مرتبہ اس نے یہ تماشہ دکھایا کہ بہت سے سوئیاں اور تاگے کے ٹکڑے منہ میں رکھے اور جب اُن کو منہ سے نکالا تو سب سوئیوں میں تاگہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی اصلیت بھی سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ تاگہ پڑی ہوئی گوٹھل سوئیاں وہ پہلے ہی سے اپنے منہ میں چھپائے ہوئے تھا۔

(باقی)

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۲ء: "غالب نمبر" قیمت ایک روپیہ۔ علاوہ محصول۔ جنوری سنہ ۳۵ء: "اُردو شاعری نمبر" قیمت دو روپیہ۔ علاوہ محصول جنوری سنہ ۳۶ء: "ہندی شاعری نمبر" قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) علاوہ محصول۔ جنوری سنہ ۳۷ء: "ڈرامہ اصحاب کہف، خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت" قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔ جنوری سنہ ۳۸ء: "تاریخ اسلامی ہند۔ قیمت عہ علاوہ محصول جنوری سنہ ۳۹ء: "مصحفی نمبر" قیمت ایک روپیہ۔ علاوہ محصول۔ جنوری سنہ ۴۰ء: "نظیر نمبر" قیمت عہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار

دار المصنفین کا تازہ کارنامہ

ہندوستان کی تاریخ

نصف صفحہ میں سات غلطیاں

اعظم گڑھ دار المصنفین نے حال میں ایک کتاب "مختصر تاریخ ہند" کے نام سے شائع کی ہے جو سلسلہ دار المصنفین کی اُنچاسویں کڑی ہے اس کے مولف مولانا سید ابو الظفر صاحب ندوی رفیق دار المصنفین ہیں، اس کے دیباچہ میں مولانا سید سلیمان تحریر فرماتے ہیں:

"خدا کا شکر ہے کہ یہ کتاب ملک میں قبول کی نظر سے دیکھی گئی اور حوصلہ سے بڑھکر قدر کی گئی، سرکار بہار نے اسکو اپنے سرکاری مدرسوں میں جاری کیا۔ یو۔پی کے محکمۂ تعلیم نے اس کے پانچسو نسخے اپنی لائبریریوں کے واسطے خرید کئے۔ میسور کی حکومت نے بھی اپنی لائبریریوں کے لئے منظور کیا قومی مدرسوں میں بھی یہ داخل نصاب کی گئی"

اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع میں ایک اچھی کتاب کا درجہ رکھتی ہوگی مگر مطالعہ کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ کیا اتنی غلط کتاب بھی لکھی جا سکتی ہے اور دُنیا اُس کی یوں قدر کر سکتی ہے۔ دو سو صفحے کی کتاب پر تبصرہ کرنے کے لئے وقت چاہئے لہذا نصف صفحہ کی غلطیاں پیش کی جاتی ہیں۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

پہلی غلطی: صفحہ ۱۹۹ پر ارشاد ہوتا ہے:-

"دلی کی سلطنت کی طرف سے برہان الملک سعادت خاں اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا کچھ دنوں کے بعد یہ خود مختار ہوگیا"

یہ ایک ایسی غلطی ہے جس کا ارتکاب اسی شخص سے ہو سکتا ہے جو اِدھر اُدھر کی سنی سنائی باتوں سے کتاب لکھنے بیٹھ جائے اور تاریخ کی کتابوں کو ہاتھ نہ لگائے اگرچہ کام بڑی جرأت کا ہے مگر کرنے والے کیا کچھ نہیں کر ڈالتے۔

سعادت خاں برہان الملک ایک ایسا شخص ہے جس نے ابتدائے عروج سے آخر زندگی تک شہنشاہ دہلی کی رفاقت و اطاعت کی سعادت خاں کے انتقال کے بعد بھی اودھ کا فرمانروا حکومت دہلی کی طرف سے مقرر کیا گیا۔ سعادت خاں کی زندگی پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے اُن کی وفاداری اور اطاعت گزاری کا حال معلوم ہو جانا کوئی دشوار نہیں۔

اُن کا اصلی نام محمد امین ہے باپ کا نام محمد نصیر سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ملتا ہے۔ نیشاپور وطن ہے انکے باپ اور بھائی ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء میں ہندوستان آئے اور پٹنہ عظیم آباد میں سکونت اختیار کی دو برس کے بعد محمد امین بھی اپنے وطن

نیشاپور سے ہندوستان آئے تو معلوم ہوا کہ باپ سفرِ آخرت اختیار کر چکا دونوں بھائی دہلی پہونچے قسمت کا ستارہ بلندی پر تھا پہونچتے ہی شاہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا یہ کام اس خوبی سے انجام دیا کہ شہرت ہوگئی اور یہ لوگوں کی نظر میں ہوشیار اور کارگزار آدمی سمجھے جانے لگے، دربار سے سعادت خاں خطاب ملا اور امرائے دربار میں گنے جانے لگے اُسی زمانہ میں اکبرآباد کے صوبہ دار کی بیٹی سے نکاح ہوگیا اب اعلیٰ طبقہ کے امراء میں شمار کئے جانے لگے، اُن کی فطری سنجیدگی اور کارکردگی سے اہم اُمور کی انجام دہی کی امید کی جاتی تھی اس زمانہ میں سادات بارہہ کا بڑا زور تھا، حسین علی خاں کے قتل کے بعد اُن کے بھتیجے عزت خاں کی سرکردگی میں سادات بارہہ نے ایک بہت بڑا لشکر ترتیب دیکے یورش کی اسوقت سعادت خاں ہی وہ شخص تھا جس پر قرعہ انتخاب پڑا اور اُس نے پانچہزار سواروں کے ساتھ اُن کی کثیر جماعت کا مقابلہ کیا ایسی شکست دی کہ ہمیشہ کے لئے اُن کا زور ختم ہوگیا اور پھر وہ سر اُٹھانے کے قابل نہ رہے، سعادت خاں دربار سے ہفت ہزاری منصب اور سات ہزار سواروں کی سرداری کے ساتھ برہان الملک بہادر جنگ کا خطاب عطا ہوا اور اکبرآباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔

اودھ کا صوبہ ایک مدت سے سرکش صوبہ تھا ہمیشہ اس کا نظام درہم و برہم رہا کرتا تھا جو صوبہ دار مقرر ہوتا تھا وہ برائے نام رہتا تھا، شیخ زادگان لکھنؤ سخت شورہ پشت تھے کسی کا دباؤ نہ کھاتے تھے۔ برہان الملک کی کارروائی اور کارپردازی پر نظر کرکے انھیں اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا اور اُس کے ساتھ ہی شاہی توپ خانہ کی داروغگی عطا ہوئی صوبہ کا انتظام انھوں نے اس بیدار مغزی سے کیا اور شیخ زادگان لکھنؤ کو اس حکمت عملی سے زیر کیا کہ بڑے بڑے تجربہ کار حیران ہوگئے اور توپ خانہ کو ہاتھ میں لیکے ایسی قوت پیدا کی کہ اُس زمانہ میں سارے ہندوستان میں کسی کو نصیب نہ تھی اس توپ خانہ کی آتش فشانی نے انھیں عوام میں بھڑ بھونجا مشہور کر دیا تھا بے شک اس زمانہ میں سعادت خاں سپاہیانہ قوت میں شہنشاہ دہلی پر فوقیت رکھتے تھے لیکن اپنے کو بدستور خدمت گزار سمجھتے رہے، چنانچہ اس زمانہ میں کوڑہ کے تعلقدار بھگونت سنگھ نے سلطنت سے منھ موڑ کر بڑا زور باندھ رکھا تھا جو افسر اُس کے سر کچلنے کو بھیجا جاتا تھا وہ مارا جاتا تھا آخر برہان الملک اس مہم پر مامور ہوئے وہ یلغار کرتے ہوئے پہونچے بھگونت سنگھ یا بلونت سنگھ سور مارا چپوتوں کو لئے ہوئے نکلا اور اس بے جگری سے آکے گرا کہ بڑے بڑوں کے حواس جاتے رہے لڑائی کا رنگ بگڑ گیا راجپوتوں نے سعادت خاں کو گھیر لیا مگر اس نے بھی ایسی بہادری سے تلوار چلائی کہ دشمنوں کے منھ پھیر دئے بلونت سنگھ جو بڑھ بڑھ کے حملے کر رہا تھا برہان الملک کے ہاتھ سے مارا گیا اُس کی فوج میدان چھوڑ کے بھاگی اور برہان الملک مظفر و منصور واپس ہوا۔

اس زمانہ میں مرہٹوں نے بہت قوت پکڑ لی تھی، انھوں نے اپنے لئے چوتھ مقرر کی تھی اور حکمرانوں سے بزور وصول کرتے تھے گویا وہ ایک طرح کا خراج لیا کرتے تھے اسی چوتھ وصول کرنے کے لئے باجی راؤ جو بالاجی بشوناتھ راؤ کا لڑکا تھا ساٹھ ہزار سوار لیکر عین اسوقت جبکہ دہلی کو کالکا کے میلے نے دلہن بنا رکھا تھا اُس پر ٹوٹ پڑا اور قتل و غارت کی آندھی بن کر ہر طرف چھا گیا ناچار بادشاہ نے اُس کے مطالبوں کو پورا کیا اور وہ لوٹتا مارتا واپس ہوا۔ برہان الملک یہ خبر سنتے ہی آندھی کی طرح اُٹھا اور مرہٹوں کا راستہ روک کے پہاڑ کی طرح ڈٹ گیا مرہٹوں نے بھی قیامت کی تلوار چلائی مگر نتیجہ میں شکست کھائی اور میدان چھوڑ کے بھاگے۔ برہان الملک ایک مدبر جنگ آزما تھا وہ اس گر سے واقف تھا کہ وقتی فتح پر خوش ہو کے حریف سے بے خبر نہ ہونا چاہئے لہٰذا اُس نے مرہٹوں کا تعاقب شروع کر دیا۔

اِدھر امرائے دربار اس کارگزاری پر حسد کے انگاروں پر لوٹ رہے تھے آخر امیرالامرا خان دوران خاں نے جو دربار میں اہل حل وعقد کا سرگروہ و پیشوا تھا یہ فقرہ برمحل سوچا کہ باجی راؤ اور بادشاہ سے جو معاملت ہوئی ہو وہ بطور مصالحت ہوئی ہو اب اس پر حملۂ شاہی رکھ رکھاؤ کے خلاف اور باعث بدنامی ہے، برہان الملک کا بغیر ایمائے شاہی باجی راؤ پر حملہ کرنا اور شاہی مصالحت کا احترام نہ کرنا انتہائی جسارت ہے۔ سادہ لوح بادشاہ جس کو اپنے نفع نقصان کی پہچان نہ تھی اس فقرہ میں آگیا ایک عتاب آمیز شقہ روانہ کیا گیا جس میں اظہار ناراضی کے ساتھ تعاقب موقوف کرکے اپنے صوبہ پر واپس جانے کی تہدید تھی۔ برہان الملک جو اپنی کارگزاریوں اور جاں نثاریوں پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اور دربار سے بڑی امیدیں باندھے بیٹھا تھا یہ شقہ دیکھتے ہی ہکا بکا ہوگیا۔ لیکن نہایت ہوشیاری سے تین شرطوں پر مرہٹوں کو امان دینے کا اعلان کیا:

(۱) مرہٹے اودھ سے کبھی چوتھ کا مطالبہ نہ کریں۔
(۲) برہان الملک کو کوئی مہم پیش آئے تو اُن کی مدد کریں۔
(۳) بغیر اُن کی اجازت کے کبھی دکن سے ادھر آنے کا رُخ نہ کریں۔

مرہٹے جو اپنی جان سے عاجز آرہے تھے اتنا سہارا بہت سمجھے اور یہ شرطیں منظور کرکے صلح کرلی اور برہان الملک اپنے صوبہ پر واپس آگئے۔

اس واقعہ کے غالباً تین سال کے بعد نادرشاہ درانی نے ہندوستان پر حملہ کیا جب اُس کا لشکر اٹک پار اُتر آیا تو ادھر کوچ کی تیاریاں ہونے لگیں دکن سے آصف جاہ اودھ سے برہان الملک طلب ہوئے باوجودیکہ برہان الملک کے پاؤں میں گاگا نکلا ہوا تھا جو نہایت اذیت چیز ہے مگر وقت کی ضرورت اور موقع کی نزاکت پر نظر کرکے فوراً کوچ بولدیا جس دن وہ شاہی لشکر میں داخل ہوا اُس روز نادرشاہ بھی سامنے پہونچ گیا تھا سب سے پہلی ٹکر اُس سے برہان الملک ہی سے ہوئی اور اُسی زمانہ میں جبکہ نادرشاہ دہلی میں مقیم تھا برہان الملک نے تپ محرقہ میں انتقال کیا۔

میں نے برہان الملک کی زندگی کا ایک اجمالی نقشہ آپ کے سامنے پیش کردیا اس میں کہیں دوسری کا رنگ نہیں جھلکتا نہیں معلوم مولف نے کہاں سے اس رازِ سربستہ کا پتہ لگایا۔

دوسری غلطی:۔ فرماتے ہیں:

"برہان الملک کے بعد اس کا لڑکا شجاع الدولہ نے حکومت کی باگ سنبھالی"

یہ غلطی پہلی غلطی سے بھی زیادہ عجیب وغریب ہے اس غلطی کے دو جزو ہیں:

(الف) برہان الملک کے بعد شجاع الدولہ حکمراں ہوئے۔

(ب) شجاع الدولہ برہان الملک کے بیٹے تھے

یہ دونوں جزو غلط ہیں: برہان الملک کے بعد شجاع الدولہ حکمراں ہوئے: شجاع الدولہ برہان الملک کے بیٹے تھے۔ برہان الملک کے کوئی لڑکا نہ تھا اس وجہ سے اُن کے بھانجے اور داماد مرزا مقیم ابوالمنصور صفدر جنگ حکمراں ہوئے جو منصور علی خاں صفدر جنگ کے نام سے مشہور ہیں اُن کے بیٹے شجاع الدولہ تھے ـــــ عبارت کی یہ ترکیب بھی قابل لحاظ ہے:-

"اس کا لڑکا" "نے"

تیسری غلطی: ارشاد ہوتا ہے :-

"اس کی (آصف الدولہ) وفات پر اُس کا بھائی نواب سعادت علی خاں اس کی جگہ نواب ہوا۔ اس نے روپیہ سے انگریزوں کی بڑی مدد کی"

اس غلطی کے بھی دو جزو ہیں :-

(الف) آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں اُن کے قایم مقام ہوئے۔

(ب) سعادت علی خاں نے روپیہ سے انگریزوں کی بڑی مدد کی۔

آصف الدولہ کے بعد اُن کے متبنیٰ مرزا وزیر علی خاں اودھ کے فرماں روا ہوئے اُن کی بے عنوانیوں سے ارکان سلطنت نے جن میں آصف الدولہ بہادر کی ماں بھی شریک تھیں انگریزوں سے ساز کرکے اُن کو معزول کردیا اُن کے بعد سعادت علی خاں متمکن ہوئے یہ بہت کنجوس آدمی تھے نقد روپیہ بھلا ان سے کوئی کیا لے سکتا تھا ہاں ان کے بیٹے غازی الدین حیدر نے اپنے زمانہ میں انگریزوں کو بہت روپیہ دیا۔

چوتھی غلطی: کہتے ہیں :-

"اُس (نصیر الدین حیدر) نے انگریزوں کے اشارے سے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا"

واقعہ یہ ہے کہ نصیر الدین حیدر کے باپ غازی الدین حیدر نے انگریزوں کے اشارے سے اپنی شاہی کا اعلان کیا جس کو مصنف نے بیٹے کی طرف منسوب کیا یہ غلطیاں صاف بتاتی ہیں کہ مصنف نے اودھ کی تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی نہیں کیا۔

پانچویں غلطی: فرماتے ہیں :-

"اس کے بعد اس کا (نصیر الدین حیدر کا) لڑکا امجد علی شاہ سلطنت کا مالک ہوا"

نصیر الدین حیدر کے بعد اُن کی بیوی نے فریدوں بخت مرزا مناجان کو تخت پر بٹھانا چاہا مگر نصیر الدین حیدر مناجان کے شاہی نسل سے ہونے کے منکر تھے اس وجہ سے رزیڈنٹ نے نصیر الدین حیدر کے چچا سعادت علی خاں کے بیٹے نواب نصیر الدولہ محمد خاں کو تخت پر بٹھانا چاہا بادشاہ بیگم مناجان کے لئے مصر تھیں اُن کی زبردستی سے جنگ کی نوبت آئی اس طرف کیا تھا معمولی سی جنگ کا بھی تحمل نہ ہو سکا، مناجان تخت چھوڑ کے بھاگے جو گرفتار کرکے قلعۂ چنار بھیجدئے گئے اور نصیر الدولہ محمد علی خاں اب ترسٹھ برس کی عمر میں معین الدین سلطان الزماں نوشیرواں محمد علی شاہ ہوئے انھیں محمد علی شاہ کے بیٹے امجد علی شاہ تھے جن کو مصنف نے نصیر الدین حیدر کا بیٹا بنایا۔

چھٹی اور ساتویں غلطی: لکھتے ہیں :-

"اب اس کے (امجد علی شاہ کے) لڑکے محمد علی اور پھر اُس کے لڑکے واجد علی شاہ بادشاہ ہوئے"

محمد علی شاہ امجد علی شاہ کے بیٹے نہ تھے بلکہ باپ تھے، نہ واجد علی شاہ، محمد علی شاہ کے بیٹے تھے بلکہ پوتے تھے۔ اور اس ترتیب سے بادشاہت منتقل ہوتی رہی یعنی محمد علی شاہ کے بعد امجد علی شاہ اُن کے بعد واجد علی شاہ ہوئے۔

یہ ہے دارالمصنفین کی تاریخ دانی کا حیرت انگیز کارنامہ جس پر یو۔پی گورنمنٹ نیز حکومت بہار و میسور نے قدر دانی کے پھول برسائے ہیں۔

محمد باقر شمس

باب الاستفسار

مُردوں کا جلانا

(جناب مرزا عبدالغنی صاحب - سارن)

مسیح کی تعلیمات میں مُردوں کے جلانے کا حکم نہیں ہے۔ لیکن اب سُنا ہے کہ یورپ میں مُردے عام طور پر جلائے جاتے ہیں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس کی ابتدا وہاں کب سے ہوئی؟

(نگار) مُردوں کو جلا کر اُن کی خاک کو محفوظ رکھنا قدیم زمانہ میں تقریباً ہر جگہ رائج تھا، لیکن بعد کو اسے ترک کر دیا گیا، یہاں تک کہ قرونِ وسطیٰ میں سوائے ہندوستان کے یہ رواج ہر جگہ سے اُٹھ گیا۔ یورپ والے اس سے بالکل آشنا نہ تھے لیکن انیسویں صدی میں یہاں بھی اس کا آغاز ہوا اور سب سے پہلے ۱۸۷۴ء میں جرمنی کے شہر برسلاؤ میں فنی حیثیت سے ایک بھٹی مُردوں کے جلانے کے لئے قایم ہوئی۔ اس کے دو سال بعد ۱۸۷۶ء میں اٹلی کے شہر میلان کے ایک امیر بیرن کللر کی لاش اس کی وصیت کے مطابق بھٹی میں جلائی گئی۔ اس نے یہ وصیت بھی کی تھی کہ اس کے ترکہ سے شہر میلان میں ایک باقاعدہ بھٹی اس غرض کے لئے طیار کی جائے۔ اس کے بعد یہ رواج نہایت تیزی کے ساتھ یوروپ میں پھیلنے لگا۔ ان لوگوں نے اپنی عادت کے مطابق اس کے فواید بتانا شروع کئے جن میں ایک فایدہ یہ بھی بتایا گیا کہ جلانے سے مُردہ کے تمام جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں اور انھیں فضا میں منتشر ہو کر دوسروں کو بیمار ڈالنے کا موقع نہیں ملتا۔

اس تحریک کے مخالف کہتے تھے کہ جلانے سے قانون و عدالت کو نقصان پہونچتا ہے۔ کیونکہ دفن کرنے کے بعد تو لاش کی جانچ کر کے موت یا قتل کی وجہ دریافت کی جا سکتی ہے، لیکن جلا دینے کے بعد اس کا امکان باقی نہیں رہتا۔

چونکہ اس تحریک کی مخالف بڑی جماعت تھی اور کلیسہ کی طرف سے بھی اس کی سخت مخالفت کی گئی، اس لئے حکومت نے اسکو قانوناً ناجایز قرار دیا۔ فرانس میں تو البتہ اس رواج کو جاری رکھا گیا لیکن ایک قانون یہ بنا دیا گیا کہ جلانے سے قبل دو ڈاکٹر اچھی طرح لاش کا معاینہ کریں۔ ایک ڈاکٹر حکومت کا، دوسرا وہ جو مرنے والے کا معالج تھا۔

مذہبی حیثیت سے اسلام اور کیتھولک مسیحیت دونوں کے نزدیک یہ طریقہ ناجائز ہے لیکن پروٹسٹنٹ جماعت اس کو نہ صرف جایز بلکہ زیادہ مناسب جانتی ہے، یہودیوں میں مخالف و موافق دونوں پائے جاتے ہیں۔

ابھی تک تمام یوروپ میں یہ رواج نہیں پھیلا، چنانچہ ہالینڈ، بلجیم، اسپین، آسٹریا اور پروشیا میں اس کی ممانعت ہے

لیکن اور بہت جگہ یہ رائج بھی ہے۔

فرانس میں سب سے پہلے سنہ ۱۸۸۹ء میں ایک بھٹی اس غرض سے طیار کی گئی اور ۹ لاشیں اس سال جلائی گئیں۔ آیندہ ۲۰ سال میں یہ تعداد ۱۴۰۰ ہو گئی اٹلی میں اسوقت ۳۰ بھٹیاں بڑے بڑے شہروں میں قایم ہیں۔ انگلستان میں بیس بھٹیاں ہیں اور سنہ ۱۹۰۹ء میں ۸۸۵ لاشیں ان میں جلائی گئیں۔ لیکن اب تعداد بہت بڑھتی جاتی ہے۔

جرمنی کے بعض حصوں میں اس کا رواج نہ تھا اور بعض میں تھا، چنانچہ یہاں ۲۵ بھٹیاں ہیں جنمیں سالانہ ہزاروں لاشیں جلائی جاتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں بھی آٹھ بھٹیاں پائی جاتی ہیں، اور سویڈن، ناروے، ڈنمارک میں دو دو۔

شمالی امریکہ میں ان کی تعداد ۳۵ ہے۔ اور جنوبی امریکہ، آسٹریلیا، چین و جاپان میں بھی ایسی بھٹیاں موجود ہیں۔

یہ بھٹیاں عموماً دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک گیس سے گرم ہونے والی۔ دوسری پتھر کے کویلہ سے۔

لاش کو ایک آہنی تختہ پر لٹا کر بھٹی میں رکھدیا جاتا ہے اور بھٹی کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہوا پہونچا کر بھٹی کی آگ کو تیز کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک گھنٹے کے اندر لاش بالکل راکھ ہو جاتی ہے اور یہ راکھ ایک شیشے میں بند کر کے وارثوں کو دیدیجاتی ہے۔

اب بجائے گیس یا کویلوں کے زیادہ تر بجلی کی بھٹیوں سے کام لیا جانے لگا ہے اور چند منٹ کے اندر لاش راکھ بن جاتی ہے

ایک سرمایہ دار کی ریاضی

مزدور روزانہ ۸ گھنٹے سوتا ہے یعنی	سال میں	۱۲۲ دن
روزانہ ۸ گھنٹے آرام کرتا ہے یعنی	سال میں	۱۲۲ دن
ہفتہ میں ایک دن اتوار کو کام نہیں کرتا یعنی	سال میں	۵۲ دن
سنیچر کو بعد دوپہر کام نہیں کرتا یعنی	سال میں	۲۶ دن
بیماری وغیرہ میں کام نہ کرنے کا اوسط	سال میں	۲۸ دن
سال میں دو ہفتے کی چھٹی یعنی		۱۴ دن
میزان		۳۶۴ دن

گویا سال کے ۳۶۵ دنوں میں وہ ۳۶۴ دن کام نہیں کرتا اور صرف ایک دن کام کرتا ہے۔

حیرت ہے کہ اب بھی مزدوروں کو سرمایہ دار کی طرف سے ظلم کی شکایت ہو!

مطبوعات موصولہ

عجائب زار منطق لکھنوی آپ نے فطرت کے کھلنڈرے پن کی بہت سی مثالیں دیکھی ہوں گی، لیکن دماغ انسانی کے ساتھ اس کا کھلنڈراپن بہت پُرلطف ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اس کی کوئی نہایت دلچسپ مثال دیکھنا ہو تو منطق لکھنوی کا یہ دیوان مطالعہ کیجئے۔ منطق صاحب ایک قدیم کایستھ خاندان کے فرد ہیں اور نظم و نثر دونوں میں کمال رکھتے ہیں۔ انکی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہو چکی ہے، لیکن دماغ و قلم کی شوخی سے ابھی تک شباب ٹپکتا ہے۔ انکے دیوان کا تعارف خود انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو

"چند سطر پُر اثر، متعلق غزل عشق و معرفت عمل بہ دلایل کمل و مدلل و مفصل میرا اسلوب بیان عارفانہ و عاشقانہ صورت حسن مجازی معشوقانہ بخلاف شعراء زمانہ نیا رنگ جداگانہ پیدا کرتا ہے"

ظاہر ہے کہ اس تعارف کے بعد کسی اور تنقید و تبصرہ کی ضرورت نہیں، لیکن آپ کو ایک بڑے لطف سے محروم رکھوں گا، اگر اُن کے بعض اشعار سُنائے بغیر اس ذکر کو ختم کر دوں:

وہ زلف پریشاں فی اللہ فنا ہے گا — دیوانہ عجب شان سے دیوانہ بنا ہے گا
جوبن ہیں الست، بھجا دست، بغل بست — دے کھول وہ گلگشت مزہ جس میں سنا ہے گا
یک دانہ چنا جم کے وہ انبار ہوا تھم کے — سچ کہئے میاں ہم سے یہ نہیں وہی چنا ہے گا
جب لمپ جلے پنچ جھکے نور سمٹ بیٹھے، — اوپر کو چلے پنچ تو کیا نور تنا ہے گا
کلمہ قرآن تیرے ہر عضو میں لکھا ہے — آؤں نماز کو میں، تو جا نماز ہو جا
تنزیب پھوڑ سُرخی، جوبن نے چھاپ مارا — اے چھاپ دل میں منطق نقش و طراز ہو جا
دل کمدہ کا سیحا تو ہی تھا — پاس تیرے دل کا کیا مسہل نہ تھا

سارا دیوان انھیں لطائف سے بھرا پڑا ہے۔

اگر آپ واقعی اپنا غم غلط کرنا چاہتے ہیں تو ۵ر کے ٹکٹ بھیجکر اس کی ایک کاپی دفتر نگار سے طلب کر لیجئے۔

نقش ناتمام جناب ستحر رام پوری کی چند نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جناب ستحر آجکل کے خوش فکر نوجوانوں میں سے ہیں اور نظم و غزل دونوں خوب کہتے ہیں۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

کس کو قبول عرض محبت کی تلخیاں — کس کو غرض کہ دل کو مجالِ قرار دے
کیوں تکلف آپ کو کچھ مجھ سے فرمانے میں ہے — ایک فقرہ کی کمی مدت سے افسانے میں ہے
اعتبار یا حُسنِ اعتبار، کیا کہئے — وہ اُدھر بھلاتے ہیں دل اِدھر بہلتا ہے
جگمگا چکے تارے، گنگنا اُٹھے دھارے — مضطراب مگر اب تک کروٹیں بدلتا ہے

انتشار کی دنیا ، انتظار کا عالم پھول جب مہکتے ہیں، چاند جب نکلتا ہے ،

اس میں شک نہیں کہ جناب سحر کے کلام میں ابھی پختگی پیدا نہیں ہوئی اور کہیں کہیں مصرعے غیر مربوط ہو جاتے ہیں، لیکن جس حد تک احساس والہیت کا تعلق ہے، وہ یقیناً فطری شاعر ہیں اور ان کا مستقبل بہت امید افزا ہے۔ خدا کرے ان کے احباب یہ زعم ان میں پیدا نہ کردیں کہ جو کچھ انھیں ہونا تھا وہ ہو چکے۔

اس مجموعہ کی قیمت ۶ ر ہے اور ملنے کا پتہ: مرزا عباس علی بیگ - باغچہ غازی مظفر خاں - ریاست رام پور۔

گناہ کا خوف

جناب چودھری محمد علی صاحب رئیس ردولی کے چند ادبی مقالات کا مجموعہ ہے۔ ہیں تو یہ فسانے لیکن میں انکو ادبی مقالات کہتا ہوں، کیونکہ ان کی زبان، ان کا انداز اور ان کا تار و پود فسانویت سے کسی قدر علٰحدہ ہے۔

ان مقالات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بجائے تحریر کے تقریر معلوم ہوتے ہیں اور ان کو پڑھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چودھری صاحب باتیں کر رہے ہیں — چودھری صاحب علیگڈھ کے اس ابتدائی دور کے فرزند ہیں، جب وہاں تعلیم و تربیت کے ساتھ انسان میں زندگی بھی پیدا کی جاتی تھی اور اس میں شک نہیں کہ چودھری صاحب اُس زمانہ کے سب سے زیادہ زندہ انسانوں میں سے ہیں — جن حضرات کو آپ سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ کی خوشدلی اور بذلہ سنجی کا کیا عالم ہے اور ان کے مزاح میں کتنی لطافت پائی جاتی ہے۔ انگریزی میں آسکر وائلڈ، چسٹرٹن اور برنارڈ شا (جو صرف آسکر وائلڈ اسکول کا خوشہ چیں ہے) Paradox کے مشہور لکھنے والے ہیں۔ اُردو میں اس رنگ کی کچھ جھلک خان بہادر میر ناصر علی مرحوم کے یہاں پائی جاتی تھی لیکن چودھری صاحب کے یہاں یہ رنگ زیادہ گہرا ہے۔

چودھری صاحب نہایت وسیع مطالعہ کے انسان ہیں، جس کا ثبوت ان کے مقالات سے بھی ملتا ہے۔ ان کی زباندانی کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہوں کہ جب وہ ٹھیٹھ ٹکسالی زبان لکھنے پر آجاتے ہیں تو اس کتابی اُردو کے زمانہ میں وہ کسی اور ملک کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ میں "امامن مہری" والا فسانہ بالکل اسی رنگ کا ہے — وہ لوگ جو زبان اور نفسیاتی تجزیہ کا امتزاج دیکھنا چاہتے ہیں انکے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ قیمت ۴ ہے اور ملنے کا پتہ: چودھری محمد علی صاحب رئیس ردولی ضلع بارہ بنکی

ہندوستان - فلسطین

آکسفورڈ یونیورسٹی نے چھوٹے چھوٹے رسالوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے جن میں حالات حاضرہ اور اُن سے متعلق پچھلے تاریخی و سیاسی معاملات سے بحث کی جاتی ہے۔ یہ رسالے ماہرین سے لکھوائے جاتے ہیں اور بہت کم قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔

اب اُردو میں بھی ان کا ترجمہ شایع ہونے لگا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں رسالے اسی سلسلہ کے ہیں۔ فلسطین کے مسئلہ پر جیمز پارکس نے سیاسی و تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالی ہے اور ہندوستان پر وشبروک ولیمز نے۔ ترجمہ بھی صاف و سلیس ہے اور قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے یعنی تین تین آنے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی، کلکتہ یا مدراس سے خط و کتابت کی جائے۔

مسافر کی ڈائری

یہ خواجہ احمد عباس کا سفرنامہ ہے جس میں انھوں نے اپنی سیاحت دنیا کا حال دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا ہے۔

سفرناموں کا مطالعہ یوں بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا، لیکن اگر ان میں کام کی باتوں کا ذکر ہو تو مفید بھی ہوتے ہیں

میری رائے میں یہ سیاحت نامہ دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی۔ قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

یارانِ میکدہ جناب عبدالشکور ام۔ اے (بریلی کالج) کی تصنیف ہے جس میں چند مخصوص ہستیوں کا سراپا مادی و نفسیاتی دونوں صورتوں سے پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کو اصرار ہے کہ ان سب کو فرض ہستی قرار دیا جائے، حالانکہ زیادہ سے زیادہ ہم ان کا نام قرض سمجھ سکتے ہیں۔

مصنف نے مزاحیہ انداز میں نفسیاتی تجزیہ بہت کامیابی سے کیا ہے، یہاں تک کہ اگر کسی شخص پر "سراپا" چھاجائے تو بھی اسے پڑھنے میں لطف آئے گا۔

یہ کتاب مکتبۂ جامعہ قرول باغ دہلی سے ملسکتی ہے۔

ہم اور وہ خواجہ محمد شفیع ام۔ اے نے اس رسالہ میں انتقادی انداز سے لیکن کافی ادبیت کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ موجودہ زمانہ کی انسانی پیداوار ماضی کی پیداوار سے کم نہیں بلکہ اس سے بہتر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا وہ دلچسپ پہلو ہو جو شاید کسی سنجیدہ تحریر کا متحمل نہ ہوسکتا تھا۔

کتاب دلچسپ ہے اور انتقادی وزن بھی کافی رکھتی ہے۔ مکتبۂ جامعہ دہلی سے ۱۲ر میں ملسکتی ہے۔

پسِ پردہ جناب اختر بریلوی کی چند نظموں کا مجموعہ ہے۔ میں نے اس وقت تک اختر صاحب کا کلام نہ دیکھا تھا۔ اب بالکل پہلی مرتبہ کتابی صورت میں اس کے مطالعہ کی نوبت آئی۔ نظمیں زیادہ تر انتقادی حیثیت رکھتی ہیں اور ایسے غیر اہم مقالی مسایل سے متعلق ہیں۔ جن میں شعر و شاعری کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

ٹروٹسکی کا بیان انقلاب روس کی تاریخ میں ٹروٹسکی کو اس لئے اور زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ اسٹالین سے اس کو سخت اختلاف تھا۔ اس کتاب میں ٹروٹسکی کے بیان سے روس کے تمام اس پس منظر کو پیش کیا گیا ہے جس پر "انقلاب" کی نقاشی ہونے والی تھی۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسٹالین و ٹروٹسکی کے اختلاف کا اصل سبب کیا تھا اور ٹروٹسکی کیوں خارج البلد کیا گیا۔

ترجمہ۔ ام۔ ام جوہر صاحب نے کیا ہے اور اچھا کیا ہے۔ قیمت ۱۰ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

مومن و غالب جناب معجز سہسوانی کی تصنیف ہے جس میں مومن و غالب کے کلام کا موازنہ کرکے فیصلہ مومن کے حق میں کیا گیا ہے۔ شروع میں، مومن کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور پھر ہم قافیہ اشعار لیکر ان پر تبصرہ کیا گیا ہے اس حقیقت کو بارہا نگار کے ذریعہ سے ظاہر کیا جاچکا ہے، کہ رنگِ تغزل میں مومن خاص مرتبہ کا شاعر ہے اور نگار کے مومن نمبر شایع ہونے کے بعد ہی مومن کا نام لوگوں کی زبان پر آنے لگا تھا۔ ہرچند مومن کو دنیا نے بہت دیر کے بعد یاد کیا، لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ اس نے یاد کیا صحیح الفاظ میں۔ جناب معجز سہسوانی نے بھی جو کچھ لکھا ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر لکھا ہے گو کہیں کہیں انکے بتائے ہوئے مفہوم سے مجھے اختلاف ہے۔ یہ رسالہ مطالعہ کے قابل ہے اور دائرۂ علمیہ فیض آباد سے دستیاب ہوسکتا ہے۔

گرام سدھار جناب عبدالشکور ام۔ اے نے اس رسالہ میں بتایا ہے کہ گاؤں کیا چیز ہے اور گاؤں والوں کو اپنی فلاح کے لئے کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کسان کے تعلقات ساہوکار، زمیندار اور حکومت سے کیونکر استوار ہوسکتے ہیں اور گاؤں کے رہنے والوں کو اپنی معیشت و معاشرت اور مویشیوں کی پرورش میں کن باتوں کا لحاظ

رکھنا چاہئے - یہ رسالہ ۶ر میں مکتبۂ جامعہ دہلی سے ملسکتا ہے۔

ضروری باتیں کسان کے لئے یہ رسالہ بھی جناب عبدالشکور ام - اے کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں تمام وہ ضروری باتیں بتائی گئی ہیں جو ایک کسان کو اپنے ملک اور صوبہ کے متعلق جاننا چاہئے۔ اس رسالہ قیمت ۲ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

شعر و شاعری حصۂ اول اس میں جناب مہدی جاپسی ایڈوکیٹ الہ آباد نے علم عروض سے بحث کی ہے اور اُردو اشعار کے ذریعہ بحور کو سمجھایا ہے۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ - دفتر خیابان - الہ آباد۔

پاکستان کی اسکیم مولانا ابوالکلام کے قلم سے سمیع اللہ صاحب صدیقی نے الہلال سے مولانا آزاد کا ایک مضمون نقل کرکے ثابت کرنا چاہا ہے کہ وہ خود کسی زمانہ میں پاکستان کے حامی تھے اور انھیں تمام باتوں کی تبلیغ کر رہے تھے جو اسوقت مسلم لیگ کہہ رہی ہے میں نہیں سمجھ سکتا کہ مولانا کے ان مضامین سے پاکستان کی تبلیغ کیونکر ثابت ہوسکتی ہے اور اگر تاویل کے بعد یہ نتیجہ نکالا بھی جائے، تو کیا ایک شخص حالات کے تحت اپنی رائے نہیں بدل سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت مولانا کی رائے ہندوستان کی سیاسیات کے متعلق مسلم لیگ سے ملتی جلتی ہو، لیکن اگر بعد کو یہ رائے انھیں بدلدی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی کسی پرانی تحریر کو معارضہ کی صورت سے پیش کیا جائے۔ اگر اس کے جواب میں مولانا صرف اس قدر کہدیں کہ میری رائے اب بدل گئی ہے تو پاکستان والے کیا کہہ سکتے ہیں۔ اس رسالہ کی قیمت ۴ر ہے۔

قرآن مشکل ہے یا آسان شیعہ ریڈیکل سوسائٹی لکھیم پور کھیری نے یہ رسالہ اس مقصد کے ساتھ شایع کیا ہے کہ لوگ خود قرآن کا مطالعہ کریں اور مولویوں یا مجتہدوں کے اقوال پر بھروسہ کرکے نہ بیٹھ رہیں۔ خود قرآن مجید کی آیات سے ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن آسان کتاب ہے اور ہر شخص کو خود اس کا مطالعہ کرکے کسی نتیجہ تک پہونچنا چاہئے۔ قیمت ۲ر۔ ملنے کا پتہ سوسائٹی مذکور۔

مختصر حالات بی بی فاطمہ مسز صغرا ہمایوں مرزا حیا کی تالیف ہے اور موضوع نام سے ظاہر ہے۔ کتاب کی زبان سہل و سادہ ہے اور ضروری مطالب پر حاوی۔

اُردو ٹکٹ ادارۂ اشاعت اُردو لاٹوش روڈ لکھنؤ نے، اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے اکابر اہل قلم کی تصاویر کے ٹکٹ طیار کئے ہیں اور ہر ٹکٹ پر ایک فقرہ اُردو زبان کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے درج کیا گیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ لوگ ڈاک کے ٹکٹ کے ساتھ ساتھ یا خط کے اندر یہ ٹکٹ بھی چسپاں کردیا کریں۔ ۸۴ ٹکٹوں کی کتاب کی قیمت ۴ر رکھی گئی ہے جو یقیناً زیادہ نہیں ہے تصویریں نہایت خوبصورت بلاک سے چھپوائی گئی ہیں۔

میری دُنیا جناب عقیل احمد صاحب جعفری خیرآبادی کی چند قومی، مذہبی اور ادبی نظموں کا مجموعہ ہے جو نہایت نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ جناب عقیل کی شاعری کی عمر زیادہ طویل نہیں، لیکن چونکہ شاعری ان کا خاندانی ورثہ ہے، اس لئے چند دن میں انھوں نے کافی ترقی کرلی ہے۔ جابجا غزل کے اشعار بھی نظر آتے ہیں مثلاً:

عشق کا سامنا عقیل اور آپ — عقل نادانیاں بھی کرتی ہے
گزر جائے گا آکے اک روز وہ بھی — عقیل آپ جس دن سے گھبرا رہے ہیں

اس مجموعہ کی قیمت بارہ آنے ہے اور جناب مصنف سے خیرآباد (سیتاپور) کے پتہ سے ملسکتا ہے۔

کشکول

اڈیٹروں کے توجہ کے قابل

چکاگو کے ایک مقالہ نگار نے کسی میگزین کو ایک مضمون لکھ کر بھیجا۔ اڈیٹر نے اس مقالہ کی اشاعت منظور کرلی اور معاوضہ بھی ملے ہوگیا۔ مقالہ نگار کو اس کی اشاعت کے انتظار ہی انتظار میں سات سال گزر گئے اور جب مضمون نگار نے اپنے وکیل کے ذریعہ سے یاد دہانی کی تو جواب یہ ملا کہ "اپنے موکل سے کہدو کہ ذرا صبر سے کام لیں"۔

اسی طرح ایک اخبار کے کسی اڈیٹر کو جو حال ہی میں آیا تھا، پرانے مسودات میں ایک مضمون ملا جو اسے بہت پسند آیا۔ اس نے مضمون نگار کو اطلاع دی کہ اس کا مقالہ شایع ہونے والا ہے۔ مضمون نگار نے شکریہ ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ میرے مقالہ کو شایع کر رہے ہیں لیکن ازراہِ کرم اس میں ایک تبدیلی کر دیجئے وہ یہ کہ اس میں اپنا ذکر کرتے ہوئے مینے لکھا تھا کہ میں دو بچوں کا باپ ہوں، لیکن اب بجائے دو کے چھ کر دیجئے"۔

پانی کے نلوں کے اندر آبادی

جنوبی آسٹریلیا میں ایک شہر ہے جس کا نام "Pipe-town" یا "نلوں کی آبادی" ہے۔ ایکبار یہاں کی میونسپلٹی نے چھ چھ فٹ قطر کے بہت سے نل منگائے تاکہ ان کے ذریعہ سے پانی دور دور تک پہونچایا جائے، لیکن مصارف کا اندازہ بہت بڑھ گیا، اس لئے یہ اسکیم ترک کر دی گئی اور ان نلوں میں بڈھے پنشن خوار لوگوں نے رہنا شروع کر دیا، کیونکہ ان کا کرایہ ادا کرنا نہیں پڑتا تھا، ان نلوں میں سونے کے کمرے کھانے کے کمرے اور ملاقات کے کمرے بھی بنا لئے گئے ہیں اور میز کرسی سے آراستہ ہیں۔ ان کو برابر برابر قطاروں میں رکھا گیا ہے اور ان کے سامنے سڑکیں بھی بنا دی گئی ہیں، تاکہ لوگوں کو آمد و رفت میں آسانی ہو۔

دلائی لاما کا نیا نام

تبت کے دلائی لاما کا نام اب بدل دیا گیا ہے اور آیندہ سے اس کا نام سرکاری کاغذات اور پبلک میں اس طرح لکھا جائے گا:۔

"جمپل گوانگ لوب سانگ وائی شی ٹنزنگ گیاٹسو"

اس کا مفہوم یہ ہے:۔

"بڑی عظمت والا، بڑا تقریر کرنے والا، غیر معمولی ذہین عقل مطلق، اصول کا پابند اور سمندر کی طرح وسیع"

کیا اچھے دن تھے

جب اول اول رھوڈیشیا میں ریل جاری ہوئی تو انجن میں بجائے کویلہ کے لکڑی استعمال ہوتی تھی اور جب راستہ میں لکڑی ختم ہو جاتی تھی تو انجن روک کر ڈرائیور، فائرمین اور مسافر سب جنگل سے لکڑی کاٹنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

اس وقت مسافر گاڑیوں کی چھتوں پر بیٹھ جاتے تھے تاکہ دو طرفہ جنگلی جانوروں کو دیکھتے جائیں اور اگر کوئی مسافر کسی جانور کا شکار کرنا چاہتا تھا تو ڈرائیور ریل کو ٹھیرا بھی دیتا تھا

انسانی مشینری کے عجائب

قلب کے ضربات کا اوسط فی منٹ ۷۲ ہے، یعنی رات دن میں ۱۰۳۸۶۰ مرتبہ - یہ بات کس قدر معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ اس طرح کیجئے کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر قلب کی یہی ضربات خون کو تمام رگوں کے اندر اتنی مرتبہ دوڑا دیتی ہے کہ اگر پیمایش کی جائے تو یہ سفر ایک ارب ۶۸ کرور میل کا قرار پاتا ہے - گویا ۶۶۴۰ مرتبہ کرۂ ارض کا طواف کر لیا !

جس وقت دماغ کسی بات سے متاثر ہوتا ہے تو وہ آناً فاناً میں کم از کم ۵۰ ۷ بڑے بڑے عضلات میں حرکت و جنبش پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح دماغ کو رات دن میں متواتر کہ خلایا (cells) سے کام لینا پڑتا ہے -

۲۴ گھنٹے کے اندر انسان کا جسم اتنی قوت صرف کرتا ہے کہ اس سے ۴۵۰ ٹن وزنی چیز کو ایک فٹ اوپر اٹھایا جا سکتا ہے اس لئے انسان کو کم از کم آٹھ گھنٹہ روز سونا چاہیئے تاکہ اس کی تلافی ہو سکے -

دندان سازی کی ابتدا

دندان سازی کا فن قدیم مصریوں کی اختراع ہے - چونکہ وہاں کے بعض مجرموں کو دانت اکھاڑ دینے کی سزا بھی دیجاتی تھی، اس لئے بالکل قدرتی بات تھی کہ اس سزا کے بعد انسان پھر کھوئے ہوئے دانتوں کی کمی کو پورا کر سکے اور اس طرح وہاں دندان سازی کا رواج ہوا - وہاں بعض مومیائی شدہ لاشیں ایسی دیکھی گئی ہیں جن کے دانت مصنوعی ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب یہ دانت بنائے گئے -

لاسلکی کا موجد کون تھا

عام طور پر مشہور ہے کہ لاسلکی کا موجد مارکونی تھا، حالانکہ یہ صحیح نہیں - اس ایجاد کا سہرا ایک فرانسیسی عالم کے سر ہے جس کا نام اڈوار برانلی تھا - سنہ ۱۸۸۷ء میں ایک جرمن عالم ہیرٹز نے ایک طریقہ ایسا ایجاد کیا جس کے ذریعہ سے بجلی کی موجیں فضا میں منتشر کی جا سکتی تھیں - اس کے تین سال بعد برانلی نے ایک آلہ ایجاد کیا جس کے اندر سے یہ منتشر موجیں گزار لی جا سکتی تھیں اور لاسلکی ٹیلی گراف محض اسی آلہ کی وجہ سے وجود میں آیا

تین آدم اور

فرعون مصر (رعمسیس ثانی) کے ۱۶۲ اولاد تھی جن میں ۱۱۱ لڑکے اور ۵۱ لڑکیاں تھیں -

سیام کے بادشاہ راما پنجم جن کا انتقال سنہ ۱۰ء میں ہوا، تین ہزار بیویاں رکھتے تھے - ان سے ۳۷۰ اولاد تھی، ۱۳۴ لڑکے اور ۲۳۶ لڑکیاں -

مولا اسماعیل سلطان مراکش (جن کا انتقال سنہ ۱۷۲۷ء میں ہوا ہے) ۸۸۸ اولاد کے باپ تھے، ۵۴۸ لڑکے اور ۳۴۰ لڑکیاں -

عینک کا موجد کون تھا

اکثر مورخین کا خیال ہے کہ عینک کا موجد، بوہیمیا کا ایک راہب کاپوسٹی تھا - یہ سنہ ۱۵۹۷ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۶۶۰ء میں مرا - لیکن فرانس والے کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل غلط ہے، عینک کا موجد ایک فرانسیسی تھا - اس کا نام شوریا تھا اور پیرس میں آنکھوں کا ڈاکٹر تھا - اس نے سب سے پہلے سنہ ۱۶۲۵ء میں لوئس سیزدھم کے لئے عینک طیار کی تھی -

دماغی تفریح

انعام پانے والے لڑکے

پچھلے مہینے دماغی تفریح کے سلسلہ میں جو کچھ پیش کیا گیا تھا، اس طرف بچوں نے کافی توجہ کی۔ جادو کے مربعہ پر بہت سے بچوں نے کامیاب غور کیا، لیکن سب سے پہلے مشیر حسین نے خسرو باغ الہ آباد سے اس کا صحیح جواب بھیجا اس لئے اُردو ٹکٹ کی ایک کاپی ان کے نام روانہ کردی گئی۔

کاغذ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر حرف M سب سے پہلے نظام الدین احمد ساکن جھوسی (الہ آباد) نے بھیجا اور دیا سلائی کی تین تیلی والا معمہ بھی انھوں نے صحیح حل کیا، اس لئے بذبات بھاشا اور شاعر کا انجام ایک ایک جلد ان کے پاس بھیجدی گئی۔

شفیق احمد صاحب مدار منزل کٹنی نے بھی تین تیلیوں کا صحیح حل بھیجا۔ شاعر کا انجام ایک جلد ان کے پاس بھی بھیجدی گئی۔

جادو کے مربعہ کا حل یہ ہے :-

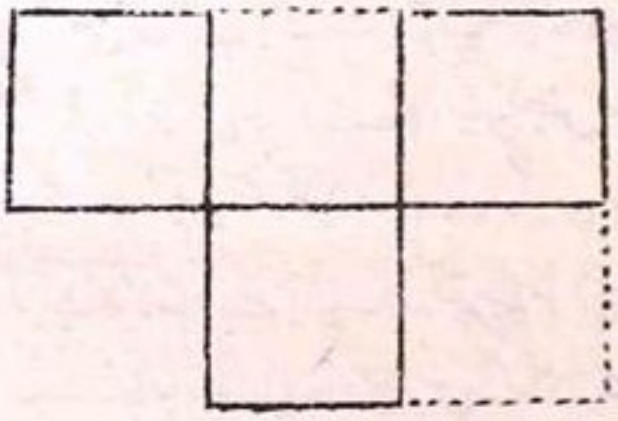

نقطوں کی جگہ کی تین تیلیاں علٰحدہ کرنے سے تین مربعے رہ جاتے ہیں

تین تیلیوں سے چار مثلث اس طرح بنتے ہیں

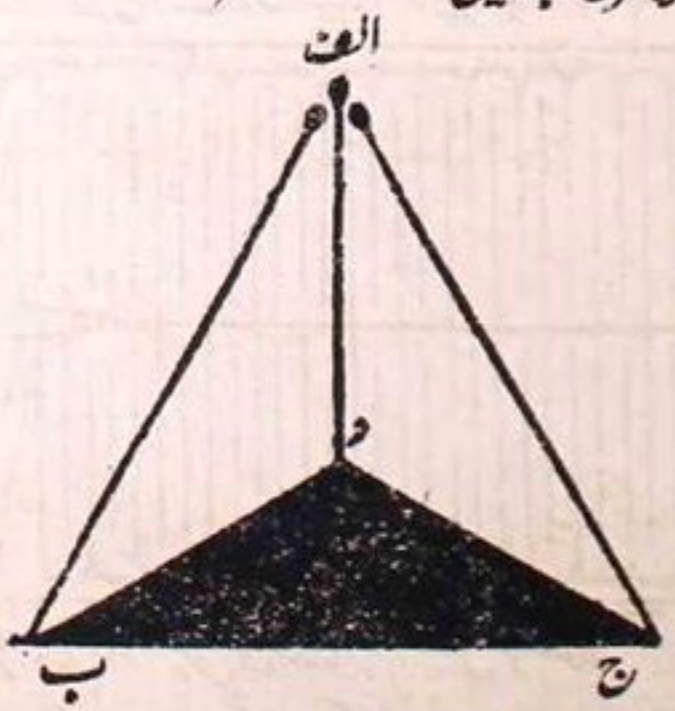

تیلیوں کو عمودی شکل میں اس طرح رکھنے سے چار مثلث بن جائیں گے

ایک مثلث (الف - ب - ج) دوسرا (الف - ج - د) تیسرا (الف - ب - د) چوتھا (ب - د - ج)

عقلی جنتری

مصر کے ایک مہندس نے ۳۲۰۰ء کی ایک عقلی جنتری طیار کی تھی جس سے بہ آسانی معلوم ہو سکتا تھا کہ اس سنہ کی فلاں تاریخ کو کونسا دن تھا۔ جنتری یہ تھی :-

(۱) جنوری فروری مارچ اپریل مئی جون جولائی اگست ستمبر اکتوبر نومبر دسمبر

۵ ۱ ۲ ۵ ۷ ۳ ۵ ۱ ۴ ۶ ۲ ۴

(۲) اتوار پیر منگل بدھ جمعرات جمعہ سنیچر

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ صفر

فرض کیجئے ہم معلوم کرنا چاہیں کہ ۹ اگست کو کونسا دن تھا، تو ۹ میں آ کا اضافہ کریں (جو اگست کے نیچے درج ہے) یہ ہو گیا ۱۰ اب ۱۰ کو ہفتہ کے سات دن سے تقسیم کر دیں تو باقی ۳ بچے گا اور تیسرا دن منگل ہوتا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ ۹ اگست ۳۲۰۰ء کو منگل کا دن تھا۔

کیا کوئی صاحب ۱۹۴۱ء کی بھی ایسی ہی جنتری بنا سکتے ہیں ؟ نگار کا ہندی نمبر سب سے پہلے کامیاب شخص کی خدمت میں تحفتہً پیش کیا جائے گا۔

ایک عجیب و غریب عدد

۲۰۱۶ عجیب و غریب عدد ہے جو ایک سے لیکر ۹ تک ہے ہر عدد سے برابر تقسیم ہو جاتا ہے کیا آپ کوئی اور عدد ایسا ہی بنا سکتے ہیں ؟

دو اور دو ہمیشہ چار نہیں ہوتے

کس قدر عجیب بات ہے ! آپ کسی سے پوچھئے کہ دو اور دو ملکر کتنے ہوتے ہیں تو وہ بلا تامل چار کہدے گا، لیکن بعض صورتوں میں دو اور دو چار نہیں ہوتے مثلاً آپ دو گیلن پانی دو گیلن پٹرول میں ملا دیں تو یہ چار گیلن نہ ہوگا بلکہ صرف ۳٫۸ گیلن ہوگا۔

سیگریٹ کے کاغذ کی وسعت

سگریٹ کا کاغذ بہت باریک اور تقریباً ۳ انچ لمبا اور ڈیڑھ انچ چوڑا ہوتا ہے۔ اگر آپ سے کہا جائے کہ ایک آدمی اس کے اندر سے گزر سکتا ہے تو آپ یقین نہ کریں گے لیکن آپ ایک تیز استرا لیکر حسب ذیل نقشہ کے مطابق اُسے کاٹ لیجئے اور پھر دیکھئے کہ آپ اس کے اندر سے کس قدر آسانی کے ساتھ نکل جاتے ہیں۔

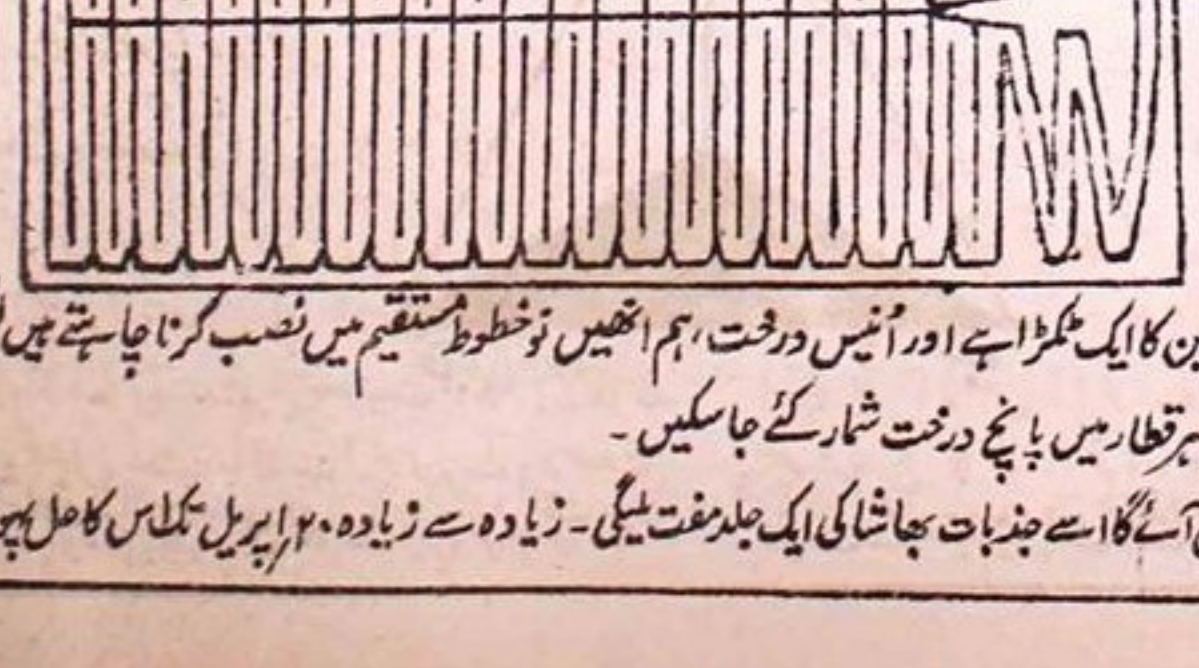

غور کیجئے

ہمارے پاس زمین کا ایک ٹکڑا ہے اور اُنیس درخت، ہم انھیں نو خطوط مستقیم میں نصب کرنا چاہتے ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہر قطار میں پانچ درخت شمار کئے جا سکیں۔

سب سے پہلے جس کا حل آئے گا اسے جذبات بھاشا کی ایک جلد مفت ملیگی۔ زیادہ سے زیادہ ۲۰ اپریل تک اس کا حل پہونچ جانا چاہئے

"عدم" کی دو نظمیں

مسائلِ لطیف :-

بے کیفیٔ خزاں تھی کہ رنگِ بہار تھا
جو کچھ بھی تھا معاملۂ اعتبار تھا

ہر چیز ہنس رہی تھی مرے آس پاس کی
عہدِ شباب خندۂ بے اختیار تھا

دل کے پردوں پہ زیست تھی پرواز آشنا
چھوٹے سے اک بگولے پہ صحرا سوار تھا

اب لذتِ فریب پرستی بھی مٹ گئی
میرا یہ حُسنِ ظن بھی اُنھیں ناگوار تھا

کیوں ہنس رہی ہے موت یہ کیا ماجرا ہوا
مجھکو تو زندگی پہ بڑا اعتبار تھا

صرف اتنی داستاں ہے مرے حادثات کی
اک رند سے مقابلۂ روزگار تھا

کب آشنائے زخم ہوا یہ نہیں خبر
دیکھا جو ایک دن تو مرا دل فگار تھا

احسانِ ناموافقتِ روزگار سے
میں اس بھرے جہاں میں غریب الدیار تھا

یوں آگیا ہے حادثۂ مرگ ناگہاں
جیسے مجھے اسی کا فقط انتظار تھا

رنگِ بہار بن کے عدم اُڑ گیا شباب
گویا کسی بلند فضا کا غبار تھا

گرمیوں کی ایک دوپہر :-

دوپہر کو تیرے محفوظ و حسیں کمرے میں
تیرے اصرار پہ وہ میرا غزلخواں ہونا

میرے رنگین تغزل کی اثر خیزی کا
تیرے ہنستے ہوئے چہرے سے نمایاں ہونا

گرم موسم کی مچلتی ہوئی تحریکوں کا
سپے بہ سپے ملتہب و تیز و درخشاں ہونا

تیری زلفوں کا بہ اندازِ جنوں ہنس پڑنا
تیرے ہونٹوں کا بہار صنمستاں ہونا

تیرے جذبات کا موجوں کی روش پر بہنا
تیری باتوں کا نمایندۂ طوفاں ہونا

پھر نگاہوں سے حکایات کا دفتر کھلنا
پھر تبسم سے خرابات کا ساماں ہونا

پھر کنایات بہ مژگاں کا فسوں بندھ جانا
پھر روایات بہ انفاس کا رقصاں ہونا

پھر مرا خاص سوالات کی صورت بننا
پھر ترا خاص جوابات کا عنواں ہونا

پھر مرا تیری عنایات کا مرکز بننا،
پھر ترا میری شکایات کا درماں ہونا

مسکراتی ہوئی آنکھوں کی دل آویزی سے
پھر بیابانِ توقع کا گلستاں ہونا

لہلہاتی ہوئی زلفوں کی جنوں خیزی سے
پھر خیالاتِ فسردہ کا درخشاں ہونا

اتنی آسانی سے ہر صورتِ امکاں کے خلاف
سر کا پھر نازکشِ زانوئے جاناں ہونا،

اتنی تکمیل سے حالاتِ زبوں کے باوصف
پھر نتائج کا بہ افراط درخشاں ہونا

دوپہر جو تری خلوت میں گزر جاتی ہے
زیست کے وہم میں اک رنگ سا بھر جاتی ہے

مجبوریاں

جب لطف و کرم دل کو تڑپائیں تو کیا کہئے
بے یاد کئے بھی وہ یاد آئیں تو کیا کہئے

وہ پرسشِ پیہم سے، دل داریِ ہر دم سے
تسکین کے پردے میں تڑپائیں تو کیا کہئے

شکوہ کا محل کوئی ڈھونڈے بھی نہیں ملتا
از راہِ نوازش وہ ترسائیں تو کیا کہئے

مجبور و حزیں دل کے لبریز پیالے کو
وہ جوشِ ترحّم سے چھلکائیں تو کیا کہئے

ہیجانِ تمنّا سے دم رُکتا ہے رُک جائے
نظروں سے بھی وہ نظریں شرمائیں تو کیا کہئے

وہ جنبشِ لب کی بھی دیتے ہیں اجازت کب
ایمائے تکلّم سے گھبرائیں تو کیا کہئے

کچھ کہئے، جو ہو کوئی انداز جُدا اُن کا
ہم سے ہی اگر وہ بھی ہو جائیں تو کیا کہئے

چتون ہو وہ بہکی سی، شوخی ہو سوکھوئی سی
اس پر بھی جو وہ ہم کو بہلائیں تو کیا کہئے

جو عشق کا عالم ہے وہ حُسن کا عالم ہے
غمناک ہوں جب دونوں دنیائیں تو کیا کہئے

اُن کے بھی تو پہلو میں پتھر نہیں دل ہی ہو
بے تاب ہوں خود، ہم کو سمجھائیں تو کیا کہئے

ہمراز نگاہوں کو آسان ہے بہکانا؟
ہمدرد جو غمخواری فرمائیں تو کیا کہئے

ملتے ہی اگر پیاسی تپتی ہوئی آنکھوں سے
ہنستی ہوئی وہ آنکھیں بھر آئیں تو کیا کہئے

جن آنکھوں میں شوخی کے تارے سے جھمکتے ہوں
وہ آنکھیں اگر موتی برسائیں تو کیا کہئے

جن پلکوں کی ہر جنبش لب ریزِ تبسّم ہو
اُن پلکوں پہ جب آنسو تھرّائیں تو کیا کہئے

ہم نے ہی بایں وحشت کیا راہ نکالی ہو
مجبور ہیں وہ بے بس ہو جائیں تو کیا کہئے

پھولوں کا تو اے کوکبؔ انجام ہے مُرجھانا
آغاز ہی میں کلیاں کمھلائیں تو کیا کہئے

کوکبؔ (شاہجہانپوری)

جوگن

۱

جُھکی جھکی چشم شرگیں میں لئے ہوئے حشر زندگی کا،
ہے چال الھڑ مگر لچیلی لٹیں ہیں شانوں پہ گیلی گیلی،
سلونے رخ پر بھبھوت جیسے چمن میں ہو شام کا دھندلکا
نچوڑی زلفوں کے چند قطرے جبیں پہ یوں جھلملا رہے ہیں
کنارِ آبِ روانِ گنگا کھڑی ہے اک نوجوان جوگن
رندھی رندھی انکھڑیاں نشیلی شباب کے ولولوں کا مدفن
سفید آنچل میں زلف سرکش ہو جیسے پانی میں کالی ناگن
کہ جیسے مندر کے بام و در پر ہوں ننھے ننھے چراغ روشن

۲

کھڑی ہوئی ہے نہا کے جوگن اُفق سے سورج نکل رہا ہے
اِدھر ہے کچھ صبح کا دھندلکا اُدھر شفق لہلہا رہی ہے
ادب سے گردن جھکی ہوئی ہے "خدائے مشرق" کی بارگاہ میں
خدائے مشرق کے پاک ہونٹوں پہ مسکراہٹ سی آ رہی ہے
مجھے یہ ڈر ہے کہ کوئی دم میں طلسم ارض و سما نہ ٹوٹے
کنوارے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ سے کل فضا تھرا رہی ہے

۳

اری اچھوتی یہ پاپ نگری اچھوتیوں کے لئے نہیں ہے
تو اپنی رعنائیوں کو لیکر اک ایسے سنسار میں چلی جا
جہاں نہ ہوں حسن کی دوکانیں جہاں نہ ہو روپ کی تجارت
جہاں گناہوں کی ہو نہ منڈی جہاں محبت کا ہو نہ سودا
جہاں نہ ہو رسم گلفروشی جہاں نہ ہو دست شوق گلچیں،
جہاں کسی کا حسین مکھڑا نہ ہو ہجوم نظر سے میلا...
جہاں نہ معصومیت کے خوں سے گناہ کی آستیں ہو رنگیں
جہاں نہ انسانیت کے سینے سے اُٹھے حیوانیت کا شعلہ
اک ایسی دنیا تلاش کرلے جہاں محبت میں ہو نہ لالچ
اک ایسی دنیا تلاش کرلے جہاں سچائی پہ ہو نہ پہرا
اک ایسی دنیا کہ شاعری جس میں خواہشوں کا نہ گیت گائے
اک ایسی دنیا کہ جس میں منطق نہ پاپ کو فلسفہ بنائے

احسن احمد اشک ام-اے (کلکتہ)

رباعیات گوہر

کیا صرف روایات کا قایل ہو جاؤں؟ کیا لغو و خرافات کا قایل ہو جاؤں؟
جو بات ہے گوہر مرے ایمان کی ضد کس طرح میں اُس بات کا قایل ہو جاؤں

جو مرتبۂ عقل و خودی جانتا ہے "مُلّوں" کی وہ ہر چال کو پہچانتا ہے
جنّت ہے اُسی کی جو ہے ان کا مُنکر دوزخ ہے اسی کی جو انھیں مانتا ہے

گوہر حسین گوہر

غزل : کاوشؔ حیدرآبادی

اے جانِ تمنا! یاد تری جسوقت مجھے آجاتی ہے اک ہوک سی دل میں اُٹھتی ہے اک آہ لبوں پر آتی ہے
امید تو ہو کوئی جو کہوں افسانۂ حسرت، حالِ زبوں! میں نالے کروں یا آہ کروں نیند آپ کو آہی جاتی ہے
میں اور خیالِ بے اثری وہ تو یہ کہو معصوم ہو تم جب آہ نکلتی ہے دل سے گردوں کی جبیں جھک جاتی ہے
روداد مصیبت ہے دنیا، گر عشق نہیں تو کچھ بھی نہیں کونین، فدا اُس ہستی پر جو زخمِ محبت کھاتی ہے
دنیا کے یہ لاکھوں نظارے، دلکش بھی ہیں دلدوز بھی ہیں معلوم نہیں انساں کو مگر کس شے کی کمی تڑپاتی ہے!

ذلّت بھی ہوئی دُکھ بھی پائے اُس بزم میں لیکن اے کاوشؔ!
معلوم نہیں وہ چیز ہے کیا جو مجھ کو وہاں لے جاتی ہے

مُغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قایم کی ہوئی واحد جہاز ران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن پورٹ سوڈان جدّہ و سوئز کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

بمبئی اور کراچی سے عدن جدّہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی مارسیلس تک مسافروں اور باربرداری کی سروسیں۔

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں

تفصیلات کے لئے خط و کتابت کیجئے:

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶- بنک اسٹریٹ بمبئی

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام ظاہری و غیر ظاہری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے قیمت تین روپیہ (۳ے) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعۂ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔ قیمت فی جلد تین روپیہ (۳ے) علاوہ محصول خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲ر)
خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-
۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ
۲- مادیین کا مذہب۔
۳- حرکت کے کرشمے۔
نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ے)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے دو آنہ (۲ر) کم

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ے)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا تہذیب و شایستگی اسکی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (۲ے)
علاوہ محصول

نمبر خریدار 316

دفتر نگار ..... لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر اے ۶۶۴

دستی

Dr: Nasir ul Hasan sb:

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس نیا گاؤں لکھنؤ (پرنٹر و پبلشر انیس حسین)